ماہنامہ (مجلہ)

حیاتِ نو

بلریاگنج

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد: ۵ —— شمارہ ۱۰، ۱۱

اکتوبر، نومبر ۱۹۹۰ء

بدل اشتراک

سالانہ زرِ تعاون : ۴۰ روپے

خصوصی تعاون : ۱۰۰ روپے

غیر ممالک : ۲۰ امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت : ۴½ روپے

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

۲۷۶۳۱۰

دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی

الفضل نعیمی پریس جوالے جمال پریس دہلی

نقوش حیات نو

● اداریہ
جنگل کا قانون ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۳

● بحث ونظر
پرویز صاحب کی اصل غلطی — خورشید احمد ندیم — ۶
لا الہ الا اللہ کا مفہوم — محمد قطب، استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ — ۲۶
جاہلی شاعری کا مطالعہ — مُبین الحق قاسمی ایم اے، علیگ — ۱۷
امین احسن اصلاحی صاحب سے چند باتیں — ابو سفیان اصلاحی — ۶۵

● تعلیم وتربیت
توجہ مطلوب ہے — عبدالبر اثری فلاحی — ۲۸

● یادِ رفتگاں
علامہ فضلِ حق خیرآبادی — توقیر عالم فلاحی — ۳۰

● تعارف وتبصرہ — عبدالبر اثری فلاحی — ۶۹

● شعر ونغمہ
غزلیں

● جامعہ کے لیل ونہار
جامعہ کھلنے کے بعد پھر بند — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۷۱
طلبہ منزل کا افتتاح
ایک استاذ جامعہ کا انتقال

جنگل کا قانون
جس کی لاٹھی اس کی بھینس

کہا جاتا ہے ایک بھیڑیئے کو بھوک لگی۔ اس کی نگاہ ایک میمنہ پر پڑی۔ اس نے سوچا کھانے سے پہلے اس پر اپنا حق ثابت کر دکھائے تاکہ اسے مجرم ثابت کر کے اپنی کارروائی کے لئے جواز پیدا کر سکے۔ اس نے یہ الزام لگایا کہ تم نے مجھے پچھلے سال گالی دی تھی، حقیر میمنے نے جواب دیا: میں پچھلے سال پیدا ہی نہیں ہوا تھا گالی کیسے دیتا؟ بھیڑیئے نے چیخ کر بولا اور کہا تم نے میری چراگاہ چر ڈالی تھی میمنہ گڑگڑایا کہ اب تک میں نے اپنی زندگی میں گھاس چری ہی نہیں۔ بھیڑیا بولا تب تم ہی نے میرے گھاٹ پر پہونچ کر پانی کو خراب کیا تھا۔ میمنے نے عرض کیا نہیں جناب، میں نے یہ حرکت بھی نہیں کی کیونکہ میری ماں کا دودھ ہی میری غذا ہے وہی میرا کھانا اور میرا پانی ہے۔ بھیڑیا دانت نکالتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا کہ اگرچہ تم نے میری ہر دلیل غلط ثابت کر دی لیکن تم پر میرا حق ثابت کرنے کے لئے تنہا میری بھوک ہی سب سے بڑی دلیل ہے، میں تمہیں کھاؤں گا۔

بات سیدھی سادی اور صاف ہے۔ ریاضی کی کوئی پیچیدہ گتھی نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ بابر کبھی اجودھیا نہیں آیا اور بابری مسجد کی تعمیر میر باقی اصفہانی نے ۱۵۲۸ء مطابق ۹۳۵ھ میں کی۔ تمام مستند تاریخی حقائق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ بابر مندر شکن ہونے کے بجائے ایک فراخ دل اور روادار حکمراں تھا، اس نے مندروں کو گرانٹ دی تھی پھر اس مسجد کا محل وقوع بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ رام کا جنم استھان ہو ہی نہیں سکتا، نیز محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ بھی اسے تسلیم نہیں کرتی۔

لیکن اس سب کے باوجود اصرار ہے کہ ہر صورت میں مندر وہیں تعمیر ہوگا۔ یہ لوگ کہتے ہیں، ہم بات کرنے کو تیار ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ بہر قیمت اور بہر صورت مندر کی بنیاد وہیں پڑے گی جہاں بابری مسجد ہے۔ عدالت کیا چیز ہے، بکرے کیا خوب ہے بھیڑیئے کی منطق !!

حالانکہ ۱۵۲۸ء کے سینکڑوں سال بعد پہلی بار انگریزوں کی شاطرانہ چال میں آکر ۱۸۸۵ء میں مہنت رگھوبیر داس نے دعویٰ کیا کہ مسجد سے باہر کا چبوترہ جو مسجد کے احاطہ میں ہے اور مسجد کے جنوب مشرقی حصہ کی طرف ہے "وہ رام کا جنم استھان ہے" اور اس پر مندر کی تعمیر کی اجازت چاہی۔ فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن نے مندر بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بات چلتی رہی۔ ۶۴ سال تک رام کا جنم استھان اور بابری مسجد دونوں قطعاً الگ الگ رہے۔ جنم استھان ہونے کا دعویٰ اس چبوترے سے متعلق تھا جو اگرچہ مسجد کے احاطہ میں تھا لیکن اصل مسجد سے الگ تھا۔ یہ دعویٰ پوری مسجد سے متعلق نہیں تھا لیکن ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں مسجد کے اندر محراب میں مورتی رکھ کر پوری مسجد کو جنم استھان بنا دیا گیا۔ جب کہ اس سے پہلے مسجد کے سلسلہ میں اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انتظامیہ نے مسجد میں تالا ڈال دیا لیکن یکم فروری ۱۹۸۶ء کو جبکہ ہائی کورٹ میں مقدمہ زیر سماعت تھا نچلی عدالت کے فیصلہ پر مسجد کا تالا کھول کر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی اجازت دے دی گئی اور حسب سابق مسلمانوں کے لئے اس کے قریب بھی پھٹکنا ممنوع رہا۔ اور اب اس مسجد کو مسمار کر کے اس کی جگہ پر مندر تعمیر کرنے کی سازش چل رہی ہے۔ سینکڑوں افراد اس کی نذر ہو چکے ہیں۔ تاریخی دستاویزات، عدالتی کاغذات، محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹیں اور خود ان کے بیانات منہ تک رہے ہیں اور دلیل صرف ایک ہے "وہی دلیل جو ہمیشہ سے ہر دور کے بھیڑیئے دیتے رہے ہیں یعنی بھوک لگی ہے "بھوک" اقتدار کی بھوک !!

مسجدیں دین کے شعائر میں سے ہیں، شعائر کا احترام اور ان کی حفاظت تا حد مقدور مومن کے ایمان کی علامت ہے۔ زندہ قومیں اپنے شعائر کی حفاظت اپنی جانوں سے بڑھ کر کرتی ہیں۔ حضور کی بعثت کا ایک اہم مقصد استخلاص کعبہ، مشرکین کے قبضہ سے اسے چھڑانا

اور بتوں سے پاک کرنا تھا۔ توحید کی دعوت دی جاتی رہی، نتیجتاً نفرت کی فضا بنتی رہی، ظلم و تشدد کی آندھیاں چلتی رہیں لیکن انھیں حالات میں حدیبیہ و حنین بھی نکلتی رہیں۔ ایک دن کیلئے بھی ایسا نہیں ہوا کہ شرک و بت پرستی کے خلاف لب و لہجہ میں ٹھہراؤ آیا ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس دعوت میں محبت کی چاشنی تھی، ایک سوز تھا، ایک درد تھا اور اس سب کی پشت پر اخلاق کی عظیم طاقت تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ کعبہ بتوں سے پاک ہوا۔

آج کے اس دور کو مکی دور سے پوری طور پر تشبیہ دی جا سکتی ہے اور مدنی دور سے بھی یہی حالات ہیں۔ ان حالات میں حکمت کی روشنی میں نظم کرنا ہمارے علماء اور قائدین کا کام ہے۔ اس حکمت عملی میں فتح مکہ کی منزل بھی آسکتی ہے، حدیبیہ کی صلح کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے دوران ساحلی سمندر پر اکٹھا ہو کر ان جانبازوں کی کارروائی بھی آسکتی ہے جو کہ مکہ میں تشدد و جبر کی وجہ سے رہ نہیں سکتے تھے اور صلح حدیبیہ کی رو سے مدینہ جا نہیں سکتے تھے۔

اس وقت ہمارا جرم سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے کہ ہم بات کو داشتہ کہتے جا رہے ہیں ظلم کو انصاف سمجھنے کی اپنے اندر ہمت و سکت نہیں پاتے، قبضہ قانون کا ہو چکا ہے مورتی پوجا بھی جاری ہے اور ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم اسے حق تسلیم کر لیں اور اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ اس عظیم جمہوری ملک میں دستور و عدلیہ اور جنگل کے قانون میں بانٹا پائی ہے۔ اب دیکھنا ہے یہاں دستور و عدلیہ کا وقار کتنا بچتا ہے۔

---

۳۰ نومبر ۱۹۹۰ء کی تاریخ آئی اور گذر گئی۔ وزیر اعلیٰ یوپی ملائم سنگھ یادو، وزیر اعلیٰ بہار لالو پرشاد یادو اور وزیر اعظم وی پی سنگھ لائق مبارکباد ہیں، انھوں نے اس معاملہ میں پہلی مرتبہ قانون کی لاج رکھنے کی کوشش کی، ورنہ جتنے بڑے پیمانہ پر اور جس منظم انداز میں تیاری کی گئی تھی کہ لگتا تھا، کہ دفعہ مسجد بچ نہیں سکے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ مسجد کا بیشتر نقصان ہوا۔

خورشید احمد ندیم

پرویز صاحب کی اصل غلطی

دینِ اسلام میں قرآن مجید کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے اس دین کے فہم کا سب سے زیادہ انحصار بھی اس کتاب کے فہم پر ہے۔ اگر قرآنِ عظیم کو صحیح اصولوں کی روشنی میں سمجھا جائے تو دین کی مجموعی تعلیمات کو پایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ تو ممکن ہے کہ آدمی کسی جزوی مسئلے یا فروعی معاملے میں غلطی کا شکار ہو جائے، لیکن بحیثیت مجموعی وہ صراطِ مستقیم ہی پر رہتا ہے۔ ان اصولوں سے ہٹ کر اگر کسی اور راستے سے فہمِ قرآن کے مسائل کی سعی کی جائے تو منزل کبھی ہاتھ نہیں آتی۔ اس سے یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ کسی ایک مسئلے میں صحیح رائے قائم کر لیں، لیکن اس دین کا سراغ آپ کو کبھی نہیں مل سکتا جس کی اتباع کا مطالبہ قرآن مجید کرتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا اصرار ہے کہ قرآن ہی ان کی فکر کا محور و مرکز ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کو غلط اصولوں کی مدد سے سمجھنا چاہا۔ اس کوشش سے فہمِ قرآن کے دروازے تو ان پر نہ کھل سکے، البتہ ضلالت ان کا مقدر بن گئی۔

اس فکر کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ دورِ جدید میں اس کی پیشوائی اور ترجمانی کا منصب جناب غلام احمد پرویز مرحوم کے ہاتھ رہا۔ انھوں نے اپنے آپ کو قرآن مجید کے ایک طالب علم کی حیثیت سے پیش کیا اور آخری لمحۂ حیات تک یہی کہتے رہے۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی کے جو مفاہیم و مطالب اخذ کیے، وہ "مفہوم القرآن"، "لغات القرآن"، "مطالب الفرقان" اور کئی دوسری کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز لفظ کا لسانی پس منظر ہے۔ وہ اسی دروازے سے کسی لفظ کے قصرِ معانی میں داخل ہوتے ہیں۔ زبان کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہے کہ وہ لفظ کے حقیقی و مجازی مفاہیم طے کرتے وقت تشبیہ و تمثیل کے کسی اصول اور سیاقِ کلام کی کسی ضرورت کا لحاظ نہیں رکھتے۔

ہمارے نزدیک پرویز صاحب کی یہی بنیادی غلطی ہے جس کے سبب سے قرآن مجید کا اصل مدعا ان پر واضح نہ ہو سکا۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ان قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھا جائے جن کا تعلق زبان و ادب کے فہم سے ہے۔ پرویز صاحب نے اس بات کا اہتمام نہیں کیا، چنانچہ وہ تاویلات کا ایک طلسم ہوش ربا قائم کرنے میں تو کامیاب رہے، لیکن صحیح مفہوم القرآن ان کی فہم سے باہر رہا۔ یہ بات اسی وقت پوری طرح سمجھ میں آ سکتی ہے جب زبان و ادب کے وہ بنیادی مسلمات ہمارے پیش نظر ہوں جن کا لحاظ فہم قرآن کے لیے ناگزیر ہے۔

زبان اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا عطیہ ہے۔ جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی نطق و ادا کی صلاحیت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں آج کئی طرح کی زبانیں رائج ہیں۔ الفاظ کے اختلاف کے باوجود اپنی ابتدا کے اعتبار سے یہ بہت حد تک ایک جیسی ہیں۔ ہر زبان کی ابتدا اصوات سے ہوئی ہے۔ تہذیب کے آغاز سے پہلے صوتی تاثرات سے مختلف مفاہیم ادا کیے جاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آوازیں لفظوں میں ڈھلیں اور اس سے باقاعدہ زبانیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ آج ہم جو لفظ بولتے ہیں، اس کا ایک متعین مفہوم ہوتا ہے۔ لفظ کے کسی خاص مفہوم کا تعلق اس کے استعمال سے طے ہوتا ہے۔ یعنی آج کسی لفظ کو سمجھنے کے لیے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ ہمارے ماحول میں کن معنوں میں مستعمل ہے۔ کوئی متکلم اس لفظ سے اپنے کلام اور تحریر میں کیا مفہوم مراد لیتا ہے۔ لہٰذا لفظ کا مطلب و مفہوم اس کے عرفِ استعمال سے متعین کیا جائے گا۔

کسی لفظ کے بارے میں دوسری چیز اس کی لسانی تحقیق ہے۔ لفظ اصل میں کیا ہے؛ اس کا مادہ کیا ہے؛ اس کی ابتدائی صورت کیا تھی؛ اور یہ کن مراحل سے گزرا ہے؛ اس ساری بحث کا تعلق علمِ لسانیات (LINGUISTICS) سے ہے۔ بعض اوقات ایک زبان میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ لسانی تحقیق سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ کوئی لفظ کس زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں علمِ لسانیات کی مدد سے کسی لفظ کا مادہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لفظ کی اس لسانی تحقیق سے اس کا مفہوم طے کرنا، استخراجِ معنی کا صحیح طریقہ نہیں۔ لفظ کے فہم کا تعلق اس کے استعمال ہی سے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص علمِ لسانیات کی مدد سے کسی لفظ کے معانی جاننے کی سعی کرے گا تو اس سے بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے اور صحیح مطلب تک پہنچنا کبھی ممکن نہیں رہے گا۔ اس بات کو

ایک مثال سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں لفظ "شوربا" کا ایک مفہوم متعین ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد کھانے کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی اپنے کھانے میں شوربے کے استعمال کا ذکر کرتا ہے تو مخاطب کے لیے سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ اب ایک شخص لفظ "شوربا" کی لسانی تحقیق کرتا ہے کہ شور "نمک کو کہتے ہیں اور "با" سے مراد پانی ہے۔ لہٰذا شوربے کا مطلب ہوگا "نمکین پانی"۔ اس تحقیق کی رو سے کھانے میں شوربے سے مراد "نمکین پانی" کا استعمال ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ لفظ کا یہ مطلب مراد لینے سے اس کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ کلام میں شوربے کے وہی معانی مراد لیے جائیں گے جن کا تعین عرفِ عام کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "میں نے ٹیلی وژن خریدا" تو اس جملے میں کوئی ابہام نہیں۔ عصر حاضر میں ہر فرد اس سے باخبر ہے کہ "ٹیلی وژن" سے کیا مراد ہے، لیکن لغوی تحقیق کے مطابق "ٹیلی" کا مطلب "انتقال" کے ہیں اور "وژن" منظر کو کہتے ہیں۔ لہٰذا "میں نے ٹیلی وژن خریدا" سے مراد "میں نے انتقالِ منظر خریدا" ہوگا۔ یہ لسانی و لغوی تحقیق درست ہونے کے باوجود فہم کلام میں مانع ہے۔ اس میں ٹیلی وژن کے اس اصطلاحی مفہوم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو متکلم کے پیش نظر ہے۔ اس بحث سے یہ واضح ہے کہ لفظ کے مفہوم کا تعلق اس کے استعمال سے ہے نہ کہ علم لسانیات سے۔

زبان کے بارے میں دوسری چیز تشبیہ، استعارہ اور تمثیل وغیرہ کا استعمال ہے۔ ہر زبان و ادب کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ بہت سی باتیں تشبیہ اور استعارے کے پیرائے میں بیان کی جاتی ہیں۔ کبھی کسی مدعا کو واضح کرنے کے لیے تمثیلی انداز اپنایا جاتا ہے۔ یہ چیز جہاں زبان و بیان کا حسن ہوتی ہے، وہاں مفہوم کے ابلاغ کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔ تشبیہ و استعارے میں جب الفاظ اپنے حقیقی معنوں سے ہٹ کر مجازاً استعمال کیے جاتے ہیں۔ جملے کی ساخت، قرینہ اور کلام کا سیاق و سباق اس بات کا تعین کرتا ہے کہ یہاں لفظ مجازی مفہوم میں استعمال ہوا ہے یا حقیقی معنوں میں۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہتا ہے: "جب سے دوپہر کا کھانا کھایا ہے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔" دوسرا شخص کہتا ہے: "گھر میں ایندھن نہیں تھا، چولھے میں آگ کیسے جلتی!" ان دونوں جملوں کی ترکیب خود گواہ ہے کہ سینے کی آگ اور چولھے کی آگ کو ایک ہی مفہوم میں لینا ممکن نہیں۔ "آگ" کے مجازی اور حقیقی مفہوم کا تعین خود جملے نے کر دیا ہے۔ اب اگر پہلے جملے میں "آگ" کو حقیقی معنوں میں لیا جائے تو ایک مضحکہ خیز صورت حال سامنے آتی ہے، جسے ایک عام آدمی کا ذوق بھی گوارا نہیں کرتا۔ تمثیلی انداز اختیار کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے مواعظ بہترین مثال ہیں، جن کے بارے میں انجیل کا کہنا ہے کہ وہ بغیر تمثیل کے کچھ نہ

کہتے تھے۔ انجیل ہی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"آسمان کی بادشاہی اس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا، مگر لوگوں کے سوتے میں اس کا دشمن آیا اور گیہوں میں کڑوے دانے بھی بو گیا۔ پس جب پتیاں نکلیں اور بالیں آئیں تو وہ کڑوے دانے بھی دکھائی دیے۔ گھر کے مالک کے نوکروں نے آ کر اس سے کہا کہ اے خداوند! کیا تو نے اپنے کھیت میں اچھا بیج نہ بویا تھا؟ اس میں کڑوے دانے کہاں سے آ گئے؟ اس نے ان سے کہا یہ کسی دشمن نے کیا ہے۔ نوکروں نے اس سے کہا: تو کیا تو چاہتا ہے کہ ہم جا کر ان کو جمع کریں؟ اس نے کہا نہیں، ایسا نہ ہو کہ کڑوے دانے جمع کرتے وقت تم ان کے ساتھ گیہوں بھی اکھاڑ لو۔ کٹائی تک دونوں کو اکٹھا بڑھنے دو اور کٹائی کے وقت میں کاٹنے والوں سے کہہ دوں گا کہ پہلے کڑوے دانے جمع کر لو اور جلانے کے لیے ان کے گٹھے باندھ لو اور گیہوں میرے کھتے میں جمع کر دو۔"[1]

اس تمثیل کی شرح بھی انجیل ہی کا بیان ہے:

"اس وقت وہ بھیڑ کو چھوڑ کر گھر میں گیا اور اس کے شاگردوں نے اس کے پاس آ کر کہا کہ کھیت کے کڑوے دانوں کی تمثیل ہمیں سمجھا دے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اچھے بیج کا بونے والا ابنِ آدم ہے۔ اور کھیت دنیا ہے۔ اور اچھا بیج بادشاہی کے فرزند اور کڑوے دانے اس شریر کے فرزند ہیں۔ جس دشمن نے ان کو بویا وہ ابلیس ہے اور کٹائی دنیا کا آخر ہے اور کاٹنے والے فرشتے ہیں۔ پس جیسے کڑوے دانے جمع کیے جاتے ہیں اور آگ میں جلائے جاتے ہیں ویسے ہی دنیا کے آخر میں ہوگا۔ ابنِ آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ اس وقت راست باز اپنے باپ کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے۔"[2]

---

۱ متی، باب ۱۳

۲ متی، باب ۱۳

اس مثال سے یہ بات واضح ہے کہ اگر بات تمثیل کے لہجے میں ہوگی تو لفظوں کو حقیقی مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حقیقی مفہوم کو مجازی مراد لینے سے بھی بات کا مدعا بدل جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے "میں ساجد اور عابد کے ساتھ بازار گیا"۔ جملہ خود تعیین کر رہا ہے کہ ساجد اور عابد معرفہ ہیں اور ان سے مراد خاص افراد ہیں۔ یہ مفہوم مراد لینے سے جملے کا مدعا بالکل واضح ہے۔ لیکن اگر جملے کی ساخت اور اس ظاہری مفہوم کو نظر انداز کر کے لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ اس قسم کی صورتِ حال سامنے آئے گی۔ ساجد: سَجَدَ سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معانی خاکساری کرنے والے کے ہیں۔ اسی طرح 'عابد' کا مطلب 'مرتاض' ہوتا ہے۔ لہٰذا جملے کا مطلب ہوگا "میں ایک خاکسار اور ایک مرتاض آدمی کے ساتھ بازار گیا"۔ لغت کے لحاظ سے تو یہ صحیح مفہوم ہے، لیکن کیا جملے میں یہی بات کہی گئی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی اور مجازی استعمال پیشِ نظر ہو۔

زبان کے حوالے سے ایک اور اہم چیز اس کا عرفِ عام ہے کیونکہ بات کے فہم کے لیے زبان کا عرف بھی جاننا لازم ہے۔ مثلاً لفظ "مقصد" ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قصد کی تحقیق کریں تو اس کا مطلب 'بھٹکی ہوئی چیز' ہے۔ لغت کو چونکہ اسی اصول پر ترتیب دیا جاتا ہے، اس لیے امام راغب کی "مفردات" اور "مقاییس اللغة" میں یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ لیکن جب "لفظ" کسی تحریر یا گفتگو میں استعمال ہوگا تو اس کا وہی مطلب قبول کیا جائے گا جس کی اجازت زبان کا عرف دیتا ہے۔ یہ عرف زبان و معاشرے کا بھی ہوتا ہے اور کسی صاحبِ فن کا بھی۔ "خودی" کو سرسید جس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، وہ اس سے بالکل مختلف ہے، جو کلامِ اقبال میں پایا جاتا ہے۔ سرسید کے نزدیک یہ ایک منفی جذبہ ہے لیکن اقبال اس کو مثبت مفہوم میں لیتے ہیں۔

زبان و ادب کے ان مسلمات کی روشنی میں قرآن مجید کو دیکھیے۔ قرآن مجید عربی زبان میں ہے، ایک خاص قوم اس کا اولین مخاطب ہے۔ اس قوم کا اپنا ایک تہذیبی پس منظر، روایات، زبان اور ادب ہے۔ قرآن انھی کی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ قرآن کی بات پوری طرح سمجھتے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا، لیکن انھیں کسی لفظ کے مفہوم کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محض کتاب نہیں بھیجی بلکہ ساتھ ایک رسول بھی مبعوث کیا جس کی سیرت قرآن کی تفسیر

کرتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید ایک کتاب ہے، جس کی ترتیب من جانب اللہ ہے۔ لہٰذا اس کا ایک سیاق ہے اور ایک سباق ہے۔ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر قرآن مجید کا مدعا پانا ممکن نہیں۔

آج کے دور میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ ایک مفسر کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عرب معاشرے کی روایات، تاریخِ عرب، عربی زبان اور اس کے مختلف اسالیب، جاہلی ادب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا گہرا مطالعہ اور ذوق رکھتا ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی یہ حقیقت کہ وہ ایک کتاب ہے اور اس کا ہر لفظ سیاق و سباق کے ایک نظم سے بندھا ہوا ہے، اس کے پیشِ نظر ہو۔

پرویز صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے ان تمام باتوں کو نظر انداز کیا اور بعض الفاظ کی لسانی تحقیق سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سے قرآن مجید کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ایسی ہی ہے جیسے کلامِ اقبال میں کوئی "خودی" کا لغوی مفہوم داخل کر دے۔[1] اس سے اقبال کی وہ بات جو وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ پس منظر میں چلی جائے گی اور ایک نیا مفہوم سامنے آ جائے گا۔ اسی طرح پرویز صاحب نے فہمِ قرآنی کے جو نقوش قائم کیے ہیں، اس سے قرآن کا مدعا تو واضح نہیں ہوتا، البتہ "مفکرِ قرآن" کا نقطۂ نظر جانا جا سکتا ہے، جسے انھوں نے قرآن مجید کی ہر آیت کے تحت بیان کیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے سورۂ نمل کا وہ مقام جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے اس سورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات، عصا اور یدِ بیضا کا تذکرہ اور اس پر لوگوں کے ردِ عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ لوگوں کے کفر کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ حقیقت ان کے لیے پردۂ راز میں ہوتی ہے، بلکہ ان کے انکار کی وجہ ان کا ظلم اور تکبر ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو جب اللہ تعالیٰ نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ ظلم و استکبار کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسانوں کا دوسرا طبقہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوتی ہے، اور وہ ردِ عمل کے طور پر اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اور اسے اللہ ہی کا فضل قرار دیتے ہیں۔ اس معاملے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] کلامِ اقبال سے کلامِ الٰہی کی تمثیل ابلاغِ مدعا کے لیے ہے۔ ورنہ قرآن مجید کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ اسے کسی انسانی کلام کی مثل قرار دیا جائے۔

انھیں ایسی عظیم الشان سلطنت عطا فرمائی جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ مگر وہ اس پر متکبر نہیں ہوئے بلکہ ان کا سر شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں جھک گیا۔ قرآن مجید میں ان کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (النمل ۲۷: ۱۷-۱۸)

"اور سلیمان کے جائزے کے لیے اس کا سارا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے اکٹھا کیا گیا اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کی وادی میں جا پہنچے۔ ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہ سلیمان اور اس کا لشکر تمھیں پامال نہ کر ڈالے اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہو۔"

غلام احمد صاحب پرویز ان آیات کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

"سلیمان کے لشکر میں شہریوں کے مہذب باشندے، جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شاہسوار سب شامل تھے۔ انھیں (کیمپوں میں) روک کر رکھا جاتا تھا تاکہ مناسب ٹریننگ اور تربیت سے ان سے مفید کام لیے جائیں۔ (ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلیمان کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت اس کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے تو وہ بطور حفظ ماتقدم، اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں وادی نمل پڑتی تھی جو ملک سبا کے قریب، اس مملکت کی سرحد پر ہی ایک ریاست تھی۔) جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں میں جاکر پناہ گزیں ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لشکر جرار نامعلوم کیے بغیر کہ تم کس کی قوم سے کسی قسم کا تعلق رکھتی ہو، انھیں تمھیں یوں ہی کچل ڈالے۔ (فوجیں یہی کچھ کرتی ہیں) ان کے راستے سے ہٹ جانا ہی قرین مصلحت ہوتا ہے۔"[۱]

۱؎ مفہوم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۸۶۶

پرویز صاحب نے یہاں جن، انس اور طیر کے معانی، بالترتیب جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی، شہروں کے مہذب باشندے اور قبیلہ طیر کے شاہسوار بیان کیے ہیں۔ اپنی لغوی تحقیق بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"قرآن میں جن اور انس سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ انسان جو مانوس تھے اور جن جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔"[۱]

"جن" اور "انس" عربی زبان کے معروف الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کا اطلاق دو مختلف مخلوقات پر ہوتا ہے۔ کلام میں اس بات کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے معروف معانی سے صرف نظر کرتے ہوئے انھیں نسل انسانی کے دو گروہوں سے متعلق قرار دیا جائے۔ لیکن جب کوئی شخص لفظ کے عام استعمال سے متعین ہونے والے مفہوم سے انحراف ہی کا ارادہ کر لے تو پھر کسی لفظ کا کوئی مطلب بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں تضاد بیانی سے بچنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ پرویز صاحب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ "مفہوم القرآن" میں، جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، "الطیر" کا مطلب "قبیلہ طیر کے شاہسوار" بیان کرتے ہیں اور دوسری جگہ "لغات القرآن" میں "تیز رفتار گھوڑے" وہ بیان کرتے ہیں:

فَرَسٌ مُطَارٌ ۔ حَلِيْبٌ — ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا۔

"سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان کے لشکر جن، انس اور طیر پر مشتمل تھے۔ جن سے مراد وحشی قبائل ہیں۔ انس، مہذب آبادیاں اور طیر، تیز رفتار گھوڑے (رسالے)۔"[۲]

لغت کے استعمال کا یہی مظاہرہ انھوں نے 'وادی نمل' اور 'نملہ' کا مفہوم طے کرتے ہوئے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں بلکہ ایک قبیلے کے مسکن کا نام ہے۔ اور النمل اس قبیلے کا نام۔ نملۃ، اس قبیلے کی ایک عورت۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عورتیں عام طور پر قبائل کی رئیس ہوتی تھیں، جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعے سے ظاہر ہے۔ یعنی یہ ان قبائل کا

۱؎ لغات القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۲۰

۲؎ لغات القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۱۰۵

تمدن تھا۔[1]

یہاں 'نملۃ' سے وادیٔ نمل کی خاتون سربراہ مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں۔ نمل عربی زبان میں اسم جنس ہے۔ اس سے کسی طرح قبیلہ مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ نمل کسی قبیلے کا نام تھا تو اس قبیلے کی خاتون کے لیے 'نَمْلِیَّۃ' استعمال ہونا چاہیے نہ کہ 'نَمْلَۃ'۔ اور اگر وہ اپنے قبیلے کی سربراہ بھی تو اسے معرفہ آنا چاہیے جب کہ 'نَمْلَۃ' نکرہ ہے۔ گویا کسی زاویے سے بھی اس لفظ کا یہ مفہوم لینا ممکن نہیں۔

پرویز صاحب کا یہ انداز تفسیر صرف سورۂ نمل ہی تک محدود نہیں، بلکہ انھوں نے پورے قرآن کو اسی انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس اسلوب تفسیر سے قرآن مجید کا انداز خطابت اس کے محاسن اور سرشار کر دینے والا منفرد انداز کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہی وہ کلام ہے جس نے انسانی تاریخ کا نقشہ بدل دیا تھا؟

سورۂ تکویر قرآن مجید کے ان مقامات میں سے ہے، جہاں قیامت کا بیان ہوا ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اس دن کا منظر کھینچا ہے جس دن یہ نظام کائنات لپیٹ دیا جائے گا۔ یہاں قرآن کا انداز دل کے ٹکڑے کر دینے والا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ایک صاحب دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، الفاظ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو تنبیہ کے انداز میں مخاطب کرتے ہیں:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۝ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝ وَإِذَا الصُّحُفُ

"جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر اُبل پڑیں گے جب کہ نفوس کی جوڑیاں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا

۱؎ لغات القرآن۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۱۶۶۵

نُشِرَتْ ۝ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۝ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۝

(التکویر ۱: ۱۴)

کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔ جب کہ صحائف کھولے جائیں گے اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی۔ تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے۔"

پرویز صاحب اس سورہ کا ترجمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جب کسی آنے والے دور میں جب انسانوں کے خود ساختہ ترقی یافتہ تمدن و معاشرت کی جگہ قرآنی نظام آ جائے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات سے متعلق یوں سمجھو کہ ملوکیت کا نظام لپیٹ دیا جائے گا اور اس کے ادنیٰ موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب بکھر کر نیچے گر جائیں گی۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت اثر جاتی رہے گی اور سرمایہ داروں جیسے محکم افراد وہ اپنی اپنی جگہ سے ہٹا دیے جائیں گے اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جاتی ہے وہ سب بے کار ہو جائیں گے۔ اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی۔ اور سمندروں میں آمد و رفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی۔ اور اطراف و اکناف کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ جب ان لڑکیوں کے متعلق جنھیں یہ شوہر زندہ درگور کر دیتا ہے اور اب بے چاریوں کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا تو پوچھا جائے گا کہ انھیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا ہے (یعنی عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے)۔ اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ اور اجرام فلکی پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے۔ ان کے حالات دریافت کیے جائیں گے۔

"اور اس وقت خدا کے قانون مکافات کا عمل تیز تر ہو جائے گا کیونکہ اس وقت اقوام عالم وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ اعمال و نتائج اور قانون کے مطابق طے پائے گا۔ لہٰذا اس کی رو سے مجرموں کے لیے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے اور اس کام کی پابندی کرنے والوں کے لیے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔ یعنی اس وقت ہر

شخص اپنے عمل کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھے گا۔"

اگر سورۂ تکویر کی آیات کا یہی مطلب لیا جائے جو "مفہوم القرآن" میں بیان کیا گیا ہے تو قرآن مجید کے بارے میں کسی حسنِ ظن کا امکان باقی نہیں رہتا۔ قرآن مجید کی ان آیات میں اتنا اثر ہے کہ یہ ایک حساس آدمی کی قلبی کیفیات کو تبدیل کر دیتی ہیں۔ جرم کی طرف بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔ انسان نیکی کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور ان جملوں کا اثر قاری کی روح تک میں اتر جاتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کا ترجمہ درست تسلیم کر لینے سے پڑھنے والے کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے دل کی دنیا بدلتی ہے اور نہ اس کا اثر اس کے اعمال پر ہوتا ہے۔ اور آدمی سوچتا ہے کہ کیا یہی وہ کلام ہے جس کو سن کر لبید نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا!

پرویز صاحب کے اس ترجمے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کچھ باتوں سے دانستہ دامن بچا کر گزرنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تفسیر بالرائے کی بدترین مثال ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک پرویز صاحب کی فکر میں پائی جانے والی سب سے بڑی ضلالت "انکارِ حدیث" ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک انھوں نے قرآن فہمی کے جو اصول متعین کیے ہیں، وہی ان کی گمراہی کا بنیادی سبب ہیں۔ قرآن مجید سے غلط استدلال کی وجہ سے انھوں نے بے شمار چیزوں کا انکار کیا۔ حدیث، معجزہ، جنات وغیرہ کا شمار اسی فہرست میں ہوتا ہے۔ اگر وہ قرآن کو صحیح اصولوں کی بنیاد پر سمجھتے تو انھیں ان سب کا ثبوت قرآن ہی سے مل جاتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور منصبِ رسالت کو ایک واضح اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تصورات کو جان لینے کے بعد ان چیزوں کے انکار کے لیے کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

(بشکریہ "اشراق" لاہور)

۔ مفہوم القرآن، جلد سوم، طلوع اسلام ۱۹۶۱ء، ۱۴۱۹

* عین الحق قاسمی
(ایم۔ اے۔ عربک)
جامعۃ الفلاح، بلریاگنج

(تیسری قسط)

جاہلی شاعری کا مطالعہ

نابغہ ذبیانی

اس کا نام زیاد بن معاویہ ہے اور ابو امامہ کنیت۔ امامہ و ثمامہ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ نابغہ لقب ہے۔ ذبیان قبیلے کا نام ہے۔ اس کے ماں اور باپ دونوں اسی قبیلے کے معزز اور شریف خاندان سے تھے۔

یہ اپنے لقب نابغہ سے زیادہ مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لقب اس کے قول "فقد نبغت لنا منھم شؤون" کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کامل تجربہ اور پوری مہارت حاصل کر لینے کے بعد شعر کہنا شروع کیا تھا اس لیے اس کا لقب نابغہ (غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا مالک) پڑ گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں شاعری کا جو عظیم سرچشمہ تھا اس کی بنا پر اسے نابغ بہتے چشمے سے تشبیہ دی گئی اور نابغہ لقب رکھا گیا۔ ۱؎

مخضرمی اور اسلامی شعراء میں کئی ایک اسی نام کے پائے جاتے ہیں جیسے نابغہ جعدی، نابغہ شیبانی اور نابغہ تغلبی۔ مگر نابغہ ذبیانی ان سب میں ممتاز اور نمایاں ہے۔

نابغہ ذبیانی کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ البتہ حیرہ کے بادشاہ

۱؎ شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی (العصر الجاہلی) ۲۶۸؛ احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی ص ۴۹؛ دیوان النابغہ ص ۳؛ شرح و تقدیم عباس عبد الساتر، بیروت ۱۹۸۴ء

نعمان بن منذر کے دربار میں اس کی رسائی اور پذیرائی کے بعد کے حالات کچھ تفصیل سے ملتے ہیں۔ یہاں اس نے نعمان کی مدح وستائش میں خوب داد سخن دی نیز اس کی بیوی متجردہ کی تعریف وتوصیف میں بھی ایک قصیدہ کہا جو بہت مشہور ہوا۔ نعمان نے بھی اس کو خوب نوازا اور اپنے پاس بہت آسائش وتنعم میں رکھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر نعمان کا ایک بہت قریبی وزیر منخل الیشکری اور کچھ دوسرے درباری جل اٹھے اور متجردہ کے ساتھ اس کو متہم گردانا۔ اس طرح بادشاہ کو اس کے خلاف ورغلایا اور النابغہ اس کے عتاب کا شکار رہا۔ وہاں سے نکل کر اس نے نعمان کے حریف غسانی بادشاہ حارث الاصغر کے یہاں پناہ لی اور اس کی مدح وستائش کی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا بھی منظور نظر ہو گیا۔ حارث کے دربار میں وہ اپنی زندگی کے شب وروز بڑی آسائش میں گزار رہا تھا کہ اس کو نعمان کی بیماری کی خبر ملی تو وہ اپنی برات اور معذرت خواہی کے لئے اس کے پاس آیا۔ اس موقع پر اس نے جو قصیدہ کہا تھا اسے ادبی دنیا میں شہرت دوام حاصل ہو گئی۔

شاعری

اس کی شاعری کا سنہرا دور نعمان بن منذر کی مدح وستائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہیں سے شعر وادب کی دنیا میں اس کی شہرت ومقبولیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی حیثیت استاد فن کی ہو جاتی ہے۔ شعراء اس کی طرف رجوع کرتے اور عکاظ کے میلے میں جب شعر وشاعری کے مقابلے ہوتے تو وہ اس کو اپنا حکم اور جج بناتے اور اس کا فیصلہ تسلیم کرتے۔

اس کی شاعری میں دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے اثرات بھی ہیں۔ حیرہ اور غسان کے شاہی دربار میں اس کی شاعری بہت نکھر گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اشعار کی تہذیب وتنقیح میں یہ اوس بن حجر اور زہیر کی طرح، اور [illegible] میں متنبی

---

۱ دیوان النابغۃ الذبیانی وجمہرۃ اشعار العرب، ص ۰۰، تحقیق علی محمد بجاوی، قاہرہ

۲ الزوزنی: شرح المعلقات العشر ص ۲۸۹، بیروت ۱۹۷۹ء ودیوان النابغہ ص ۴۰ وجمہرۃ، تحقیق ص

کی طرح تھا۔

اس کے اشعار کو تین قسموں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ قسم اول ان شعروں کی ہے جو اس نے حیرہ کے بادشاہ نعمان کی مدح سرائی اور اس سے معذرت خواہی میں کہے۔ قسم ثانی وہ اشعار رکھے جاتے ہیں جو اس نے غسانی بادشاہ حارث الاصغر کی تعریف اور اس کی قدردانی میں کہے۔ اور قسم ثالث ان اشعار پر مشتمل ہے جو قبیلے کے بعد و احوال اور اس سے متعلق جنگ [illegible] کے بارے میں کہے۔

جو چیزیں اس کو دوسروں سے ممتاز ونمایاں کرتی ہیں وہ یہ ہیں:

کلام میں جدت وندرت، اشارہ میں حسن ونزاکت، مضمون کی صفائی وتصنع وتکلفات کی کمی، اسلوب بیان نہایت دلکش، الفاظ سہل اور خوبصورت، جذبات واحساسات کی عمدہ شراحت، سب سے بڑھ کر مدح سرائی اور معذرت خواہی میں غیر معمولی صلاحیت، اپنے جذبات کو موثر بنانے اور سامع کے دل ودماغ میں اتار دینے میں اسے بڑا عبور حاصل تھا۔

معاصرین میں اس کی قدر ومنزلت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے اشعار زبان زد خاص وعام تھے، یہاں تک کہ بلند پایہ شعراء بھی اس کے اشعار بہت ذوق وشوق سے پڑھتے اور محظوظ ومستفید ہوتے جنہیں اعشی، حسان، اور خنساء زیادہ مشہور ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نابغہ کے اشعار میں "اِقْوَاء" کا عیب پایا جاتا تھا جسے ایک مرتبہ اس نے ایک گویے کی زبان سے سنا تو اسے بہت برا لگا اور اس کی اصلاح کرلی، پھر اس کے بعد سے یہ عیب نہیں پیدا ہونے دیا۔

بقول ابو عمرو بن علاء اقوا کہتے ہیں قوافی میں اعراب کا مختلف ہو جانا۔ اس طرح پر کہ ایک قافیہ کچھ زیادہ ابھر جائے اور دوسرا دبکا رہ جائے۔

---

۱ شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی (العصر الجاہلی) ص ۲۷۱ والزوزنی شرح المعلقات العشر

۲ احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی ص ۵۰

نمونۂ کلام

اس کی شاعری کا سب سے شاہکار نمونہ اس کا وہ معلقہ ہے جو اس نے نعمان بن منذر کی مدح سرائی اور اس سے معذرت خواہی میں کہا تھا۔ مفضل ضبی، ابو عبیدہ، ابو زید قرشی اور تبریزی کے خیال کے مطابق اس کا یہ قصیدہ سب سے اچھا اور بہترین ہے۔ [1]

اس قصیدے میں کل ۵۰ اشعار ہیں، اور یہ دالیہ ہے۔

جاہلی شعری روایت کے مطابق اس کی ابتدا تشبیب سے ہوتی ہے مگر تشبیب و تغزل کا رنگ یہاں بہت پھیکا دکھائی دیتا ہے، چند ہی اشعار کے بعد روئے سخن اونٹنی کی تعریف و توصیف کی طرف پھر جاتا ہے، جہاں اس نے بہت زور بیانی کا ثبوت دیا ہے۔ پھر وہ مدح و اعتذار کی طرف آتا ہے تو کمالِ فن کا مظاہرہ کرتا ہے، یہاں اس کی شاعری نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔

اس طرح نابغہ کے اس قصیدہ کے مرکزی مضامین حسب ذیل ہیں۔

تشبیب و تغزل، اونٹنی کی تعریف و توصیف، مدح سرائی۔ معذرت خواہی

اب ہم ان میں سے ہر مضمون سے متعلق کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کریں گے۔

تشبیب و تغزل

شاعر اپنی محبوبہ "میہ" کے گھر کے شکستہ آثار کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

يا دارَ ميّةَ بالعلياءِ فالسندِ	أقوتْ وطالَ عليها سالفُ الأبدِ
وقفتُ فيها أُصيلاناً أُسائلُها	عيّتْ جواباً وما بالربعِ من أحدِ
إلا الأواريَّ لأياً ما أُبيّنُها	والنؤيُ كالحوضِ بالمظلومةِ الجلدِ

ہائے "میہ" کا وہ گھر جو مقام علیا اور سند میں عرصۂ دراز سے خالی پڑا ہے۔ میں اس میں شام کے وقت ٹھہرا اس سے سوال کرتے ہوئے تو وہ جواب

[1] دیوان نابغہ ص ۹ و الزوزنی: شرح المعلقات العشر ۲۹۱

دینے سے عاجز رہا، اس حال میں کہ اس کے صحن میں کوئی نہیں تھا۔

سوائے ان کھونٹوں کے جنھیں بمشکل پہچان سکا اور حوض کے مانند اس نالی کے جو غیر موزوں اور سخت زمین میں بنائی گئی تھی۔

اونٹنی کی تعریف و توصیف

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے جب وہ دیکھتا ہے کہ اب ان شکستہ آثار میں سر کھپانے سے کوئی فائدہ نہیں، تو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اس کے لیے وہ ایک مضبوط و توانا اونٹنی پر کجاوہ چڑھانے کے لیے کہتا ہے، یہیں سے وہ اونٹنی کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

فعدِّ عمّا ترى إذ لا ارتجاعَ له	وانمِ القتودَ على عيرانةٍ أُجُدِ
مقذوفةٍ بدخيسِ النحضِ بازلُها	له صريفٌ صريفَ القعوِ بالمسدِ
كأنّ رحلي وقد زالَ النهارُ بنا	يومَ الجليلِ على مستأنسٍ وحدِ
من وحشِ وجرةَ موشيٍّ أكارعُه	طاوي المصيرِ كسيفِ الصيقلِ الفردِ

جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اس سے توجہ ہٹاؤ کہ اب اس کی واپسی ناممکن ہے اور کجاوہ کسو ایسی مضبوط و توانا اونٹنی پر کہ

جس کا نوعمر بچہ پُر گوشت و گٹھیلے بدن والا ہے، اس کے لیے چرخے کی سی آواز ہے جب وہ رسی سے بندھا ہوا ہو۔

وادیٔ جلیل میں جب کہ دن ڈھل چکا ہے میرا کجاوہ ایسے تنہا مونس کے اوپر ہے جو کہ وجرہ کے وحشی جانوروں میں سے ہے جو نشان زدہ ہے اور پچکے پیٹ والی بے مثال تلوار کی طرح ہے۔

مدح سرائی

شدہ وہ نعمان بن منذر کے پاس پہنچتا ہے جہاں اسے دلی سکون اور حقیقی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس کی مدح میں

کہے گئے چند ابتدائی اشعار:

فتلك تبلغني النعمان إن له ... فضلا على الناس في الأدنى وفي البعد

ولا أرى فاعلا في الناس يشبهه ... ولا أحاشي في الأقوام من أحد

إلا سليمان إذ قال الإله له ... قم في البرية فاحددها عن الفند

وخيس الجن إني قد أذنت لهم ... يبنون تدمر بالصفاح والعمد

فمن أطاعك فانفعه بطاعته ... كما أطاعك وادلله على الرشد

ومن عصاك فعاقبه معاقبة ... تنهى الظلوم ولا تقعد على ضمد

یہ اونٹنی مجھ کو نعمان کے پاس پہنچا دے گی جس کا احسان تمام قریب اور دور کے لوگوں پر ہے۔

اور میں بلا استثنا کسی کو لوگوں میں اس جیسا مرد کار نہیں دیکھتا ہوں، سوائے سلیمانؑ کے جب ان سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مخلوق میں اُٹھ کھڑے ہو اور ان کو برائی سے روک دو۔

اور جنوں کو تابع کر دو میں نے ان کو اجازت دے دی ہے کہ وہ وسیع و عریض چٹانوں اور ستونوں سے "تدمر" کی تعمیر کریں گے۔

جو تمہاری اطاعت کرے اس کو اس کی اطاعت کے مطابق فائدہ پہونچاؤ اور بھلائی کی طرف اس کی رہنمائی کرو۔

اور جو تمہاری نافرمانی کرے اس کو ایسی سزا دو کہ وہ ظلم کو روک دے اور تم ظلم کا ساتھ نہ دو۔

معذرت خواہی مدح و ستائش کے بعد وہ نعمان کی بدگمانی اور ناراضگی کو دور کرنے کے لئے اپنی براءت و صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فلا لعمر الذي مسحت كعبته ... وما هريق على الأنصاب من جسد

والمؤمن العائذات الطير يمسحها ... ركبان مكة بين الغيل والسعد

ما قلت من سيء مما أتيت به ... إذا فلا رفعت سوطي إلي يدي

إلا مقالة أقوام شقيت بها ... كانت مقالتهم قرعا على الكبد

إذا فعاقبني ربي معاقبة ... قرت بها عين من يأتيك بالفند

أنبئت أن أبا قابوس أوعدني ... ولا قرار على زأر من الأسد

مهلا فداء لك الأقوام كلهم ... وما أثمر من مال ومن ولد

قسم ہے اس ذات کی جس کے کعبہ کا میں نے مسح و طواف کیا اور اس خون کی جو کہ قربان (استھانوں) پر بہایا گیا ہو۔

قسم ہے سعد اور غیل کے درمیان ان پناہ گزیں چڑیوں کو پناہ دینے والے کی جن کا مکہ کے سوار زیارت کرتے ہیں۔

میں نے کوئی ایسی بری بات نہیں کہی جو آپ کو پہونچی ہو، کیونکہ اگر ایسا ہو تو میرا ہاتھ شل ہو جاتا، اور مجھ میں کوڑا اٹھانے کی سکت نہ رہ جاتی۔

سوائے کچھ لوگوں کی باتوں کے جن کی بدبختی سے میں دوچار ہوا کہ ان کی باتیں بہت جگر خراش تھیں، تب تو میرے آقا نے مجھے ایسی سزا دی کہ جس سے ان لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں جو بے جا تہمت لگاتے ہیں۔

مجھے خبر پہونچی ہے کہ ابو قابوس (نعمان) نے مجھے دھمکی دی ہے، اور شیر کی دھاڑ سے کوئی سکون نہیں رہتا۔

ٹھہریئے، ساری قومیں اور اس کا تمام سرمایہ مال ہو یا اولاد سب آپ پر قربان ہیں۔

اب تک کی بحث میں امرؤ القیس، زہیر اور نابغہ ذبیانی کا اجمالی تذکرہ کیا گیا۔ ان تینوں شعراء کا شمار طبقہ اولیٰ میں ہوتا ہے کما مر۔ امتیازی خصوصیات کے اعتبار سے بھی ان کو تمام جاہلی شعراء پر فوقیت حاصل ہے۔ قصائد کے پیش نظر اب عنترہ کی شاعری کا تذکرہ کئے بغیر اس سلسلے کی ایک اہم بحث "جاہلی دور کا سب سے چھاتی شاعر کون؟" شروع کی جا رہی ہے۔

جاہلی دور کا سب سے اچھا شاعر کون؟

جاہلی شاعری کے مطالعہ میں اشعر الشعراء

(سب سے اچھا شاعر) کی بحث بہت اہم ہے۔ یہ ایک تنقیدی بحث ہے۔ عربوں کے یہاں ادبی تنقید کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے۔ ابتداء میں تنقیدی شعور بہت سطحی ہوا اور محدود تھا۔ کسی شاعر کی کسی خاص فنی خوبی کو دیکھ کر اس کو سب سے اچھا شاعر کہہ دیا جاتا تھا۔ کلام کے مجموعی جائزے کی طرف توجہ کم ہوتی تھی۔ بقول ڈاکٹر عبدالباری:

"قدیم ناقدین فن میں سے بیشتر جب کسی شاعر کے شعری محاسن پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہیں تو کسی ایک فنی خوبی یا کسی ایک صنف شاعری میں دیگر شعراء کے مقابلے اس کی بالادستی کو دیکھتے ہوئے مجموعی طور پر اس کے سب سے اچھا شاعر ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس فیصلے میں حقائق سے زیادہ ان کے اپنے مزاج کا دخل ہوتا ہے۔ فن کے مجموعی جائزے کا تنقیدی شعور خال خال ہی ملتا ہے۔ ان حالات میں صحیح نتائج اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے۔"[1]

جاہلی دور کا سب سے اچھا شاعر کون ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ چنانچہ فرزدق نے امرؤ القیس کو، جریر نے نابغہ کو، اخطل نے اعشیٰ کو، ابن احمر نے زہیر کو، ذوالرمہ نے لبید کو، ابن مقبل نے طرفہ کو اور کمیت نے عمرو بن کلثوم کو سب سے اچھا شاعر بتایا ہے۔

دراصل یہ اختلاف بھی اس لئے نظر آتا ہے کہ مذکورہ بالا شعراء میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی صنف میں خصوصی مہارت اور امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر مارون عبود:

لکلّ شاعرٍ فحلٍ غيره بابٌ يبدع فيه - فلامرئ القيس: حسن الوصف

[1] جریر: شخصیت اور شاعری؛ ص ۶؛ سنہ ۱۹۸۵ء علی گڑھ

والتشبيه والابتكار والتصرف بالمعاني.

ولزهير: الحكم والمدح والصناعة الشعرية أي إتقان التهذيب.

وللنابغة: التحسر والاعتذار وجودة القريحة والإحاطة بالموضوع جميع أطرافه.

وللأعشى: الزينة الشعرية.

ولعمرو بن كلثوم: الفخر والحماسة.

وللحارث بن حلزة: البرهان والحجة.

وللمهلهل: رقة الشعور والشعر والحماسة[1]

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ:

"أشعر الشعراء أربعة: زهير إذا رغب والنابغة إذا رهب والأعشى إذا طرب وامرؤ القيس إذا ركب."

یعنی تمام جاہلی شعراء میں حسب ذیل چار شعراء امتیازی شان رکھتے ہیں:

زہیر: جب اسے کچھ ملنے کی امید ہو یعنی مدح اور حکمت و فلسفہ میں۔ النابغہ الذبیانی: جب ڈرا ہوا ہو یعنی معذرت خواہی میں۔

اعشیٰ: جب مست ہو یعنی وصف خمر اور مدح و ہجو میں اور امرؤ القیس: جب سوار ہو یعنی گھوڑے کی تعریف میں۔

اصمعی کی بیان کردہ تعبیر اس سے ذرا مختلف ہے اور وہ یہ ہے:

كفاك من الشعراء أربعة: زهير إذا طرب، والنابغة إذا رهب، والأعشى إذا غضب، وعنترة إذا كلب[2]

[1] الأدب العربي؛ ص ۵۴

[2] ابوزید قرشی: جمہرۃ اشعار العرب، ص ۳۳

ابوعبیدہ کے نزدیک اشعر الشعراء کی ترتیب یہ ہے۔

پہلے امرؤ القیس پھر زہیر پھر نابغہ، پھر اعشیٰ، پھر لبید، پھر عمرو، پھر طرفہ۔

بیشتر ادبا اور ناقدین نے امرؤ القیس کو جاہلی دور کا سب سے اچھا شاعر بتایا ہے۔

۱۔ یونس بن حبیب کہتے ہیں کہ بصرہ کے علماء امرؤ القیس کو تمام جاہلی شعراء پر فوقیت دیتے تھے۔

۲۔ لبید سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا شاعر کون ہے؟ تو اس نے کہا "الملک الضلیل" (امرؤ القیس)

۳۔ اسی طرح فرزدق سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا "ذو القروح یعنی امرؤ القیس"[۱]

۴۔ بقول جمحی: مروان بن حفصہ کے پاس زہیر کا قصیدہ پڑھا گیا تو اس نے کہا "زہیر اشعر الناس" زہیر سب سے اچھا شاعر ہے۔ پھر اعشیٰ کا قصیدہ سنایا گیا تو کہا "بل هذا اشعر الناس" بلکہ اعشیٰ سب سے اچھا شاعر ہے پھر جب امرؤ القیس کا پڑھا گیا تو گیا اس پر بے خودی طاری ہو گئی اور کہا "امرؤ القیس واللہ اشعر الناس"۔ بخدا امرؤ القیس سب سے اچھا شاعر ہے۔[۲]

۵۔ کہا جاتا ہے کہ عبد الملک کے پاس کچھ شرفا اور شعراء جمع ہوئے تو اس نے ان لوگوں سے عرب کے لطیف ترین شعر کہنے والے کے بارے میں پوچھا تو سب نے امرؤ القیس کے اس شعر پر اجماع کیا ؎

وما ذرفت عيناك الا لتضربي بسهميك في اعشار قلب مقتل

۶۔ کس قدر بلیغ ترین تعبیر میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ:

ان الشعر كان جملا فنحرا فأخذ امرؤ القيس رأسه[۳]

یعنی (لوگ سمجھو کہ) شعر ایک اونٹ تھا جسے ذبح کر دیا گیا تو امرؤ القیس نے اس کا

۱۔ ابن سلام الجمحی: طبقات فحول الشعراء ص ۴۰۔ و دیکھیے ابن فروخ: تاریخ الادب العربی ۱۷

۲۔ ابن قتیبہ: الشعر والشعراء ص ۱۶۔

۳۔ ابو زید قرشی کے مطابق یہ قول فرزدق کا ہے: جمہرۃ ص ۶۷

کا سر لے لیا۔

امرؤ القیس کی اسی فنی سربلندی کا وجہ سے بہت سے شعراء نے اس کے کلام کا تتبع کیا ہے۔ اور اس کے بہت سے اشعار پر تضمین کی ہے اس طرح یعنی اپنی نظم کے لئے دستور و رو عمل کی حیثیت ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر امرؤ القیس کا یہ شعر ؎

وقوفا بها صحبي علي مطيهم يقولون لا تهلك اسى وتجمل

اس کو مشہور شاعر طرفہ نے اپنے شعر میں اس طرح استعمال کیا ؎

وقوفا بها صحبي علي مطيهم يقولون لا تهلك اسى وتجلد

گھوڑے کی تعریف میں امرؤ القیس کا یہ شعر ؎

ويخطو على صم صلاب كأنها حجارة غيل وارسات بطحلب

اس کو ابو جعدی نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

حجارة غيل برضراضة كسين طلاء من الطحلب

امرؤ القیس نے اونٹنی کی تعریف میں کہا ؎

كأن الحصى من خلفها وامامها اذا نجلته رجلها حذف اعسرا

ابو شماخ نے اسی کو اس طرح لیا ہے ؎

لها منسم مثل المحارة خفه كأن الحصى من خلفه حذف اعسرا

عورت کی تعریف میں امرؤ القیس کا شعر ؎

نظرت اليك بعين جارئة حوراء حانية على طفل

اس کو المسیب نے اپنے شعر میں اس طرح استعمال کیا ہے ؎

نظرت اليك بعين جارئة في ظل بارده من السدر

اس کے علاوہ گھوڑے کی تعریف میں اس کے متعدد اشعار کی نقل و تقلید کرنے والے شعراء میں اوس بن حجر، کعب بن زہیر، نجاشی، طفیل اور زید الخیل وغیرہ ہیں۔

امرؤ القیس کے علاوہ دوسرے شعراء جن کے بارے میں کسی کی حیثیت سے "اشعر الشعراء"

(بقیہ ص ۲۳ پر)

توجہ مطلوب ہے
طلبہ کے سرپرستوں سے

ششماہی چھٹی گذار کر بچے نئے عزم و حوصلے کے ساتھ از سرِ نو تعلیم و تعلم کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے آج ہی حاضر ہوئے ہیں۔

استاذ: (درجے میں داخل ہوتے ہوئے) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طلبہ ———— وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استاذ: (طلبہ کی خیریت پوچھتے ہوئے) آپ اور آپ کے گھر والے کیسے ہیں؟

طلبہ: (جواب دیتے ہوئے) الحمد للہ

استاذ: (چھٹی کی مصروفیت دریافت کرتے ہوئے) آپ نے چھٹی کیسی گذاری؟

طلبہ: (باری باری جواب دیتے ہیں) میں نے یہ پڑھا، میں نے یہ لکھا، میں نے یہاں کی تفریح کی، میں نے فلاں پروگرام میں حصہ لیا۔ وغیرہ وغیرہ

استاذ: (۹ سال کا بچہ زید سے مخاطب ہوتے ہوئے) اچھا تم یہ بتاؤ کہ چھٹی کے درمیان تم نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟

زید: (جواب دیتے ہوئے) جی نہیں

استاذ: (وجہ دریافت کرتے ہوئے) کیوں؟

زید: (جواب دیتے ہوئے) ابو نماز نہیں پڑھتے، امی نے بھی نہیں

پڑھتا تھا۔

استاذ پر ایک بجلی سی گر پڑتی ہے وہ تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے اور سوچتا ہے سچ کہا ہے جس نے بھی کہا ہے "بچے بندر ایک ہوتے ہیں" یعنی جس طرح بندر دوسرے کی نقل اتارتا ہے اسی طرح بچے بھی نقل اتارتے ہیں۔ اور اپنے سرپرست، ذمہ داران، وابستگان اور معاشرے کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح صرف استاد کے بس میں نہیں جب تک کہ یہ تمام لوگ استاد کا تعاون نہ کریں اور ان کا تعاون یہ ہے کہ وہ خود اپنے ماتحتین کو پند و موعظت کرتے رہیں اور ان کے سامنے اسوۂ حسنہ پیش کریں تاکہ بچے اسی کی نقل اتاریں ورنہ ان کی تعلیم و تربیت میں نقص اور اس کی وجہ سے آنے والی گمراہی میں سرپرست بھی شریک ہوں گے اور اس کے وبال کا مزہ انھیں بھی چکھنا ہوگا۔

ذرا سوچئے، بیدار ہوجئے، چونکئے اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پہچانئے، ورنہ انجام کار سوچ لیجئے ... ... ؟؟؟

جامعہ کے لیل و نہار

محمد طارق صاحب فلاحی، ماسٹر محمد بشیر صاحب، مولانا صغیر احسن صاحب، سکریٹری جمعیۃ الطلبہ جاوید سلطان سلمہ اور راقم نے اپنے خیالات پیش کئے۔ مولانا صغیر احسن صلاحی صاحب نے یہاں تک کہا کہ مجھے اس صالح ذہین فلاحی کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے جس کی صالحیت و سادگی اور متعدد خوبیوں کی بنا پر میں نے اسے اپنے گھر رشتہ کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسے میں اپنا داماد بنانا چاہتا تھا یہ دوسری بات ہے کہ کچھ وقتی اسباب کی بنا پر میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

چھپتے چھپتے :-

آج ۱۳ ر نومبر شنبہ ہے۔ جامعہ دوبارہ کھل چکا ہے۔ طلبہ کی ایک خاصی تعداد بھی آچکی ہے درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز ہو چکا ہے۔

توقیر عالم فلاحی
شعبۂ عربی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علامہ فضل حق خیرآبادی

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے فروغ و اشاعت میں جن باکمال اور موقر شخصیتوں نے بیش بہا خدمات دی ہیں ان میں علامہ فضل حق خیرآبادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ۱۷۹۷ء میں خیرآباد ضلع سیتاپور کے اس مردم خیز قصبے میں پیدا ہوئے جو ہر دور میں علمائے دین کا مسکن تھا۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ بھی بلاشبہ علمی ماحول تھا۔ والد محترم مولوی فضل امام وقت کے جید علمائے دین میں تھے چنانچہ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے ہی گھر میں حاصل کی۔ حدیث کی تعلیم کے لئے مولانا عبدالقادر دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور قلیل مدت میں ہی اپنے کشکول کو علم و حکمت سے پر کیا۔

بلاشبہ ہر دور اور ہر صدی میں ایسی نامور ہستیاں منظر عام پر آتی ہیں جو علوم و فنون کے سمندروں میں غوطہ زنی کر کے عہد ساز شخصیت کے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی انھیں عبقری شخصیتوں میں ہیں جنہوں نے چار سال میں حفظ قرآن کی مہم سر کی اور صرف تیرہ سال کی عمر میں منطق، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری گویا مروجہ علوم و فنون سے سند فراغت حاصل کرلی۔ آپ کی جلالت علمی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک

طرف منقولات و معقولات کے دقائق تھے تو دوسری طرف فنون ادبیہ میں بھی مہارت تامہ حاصل کرلی تھی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کی جرأت مندانہ شخصیت میں ہنومان گڑھی کے اس مشہور واقعہ جہاد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں امیر علی امیر المجاہدین تھے۔ حسب روایت تاریخ اودھ کے مؤلف مولوی حکیم نجم الغنی، مفتی سعد اللہ رامپوری اور مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے ساتھ مولانا فضل حق خیرآبادی بھی تھے۔ آپ نے فیروز راک کی رکنیت میں امیر علی کی اور جہاد ہنومان گڑھی کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مہم میں شریک ہو کر اس کی تلافی کریں گے۔ اور ہوا بھی یہی کہ جب انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کا علم بلند کیا گیا تو ۱۸۵۷ء میں مولانا پورے طور پر انگریزوں کے برسرپیکار ہو گئے۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے اور لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے گویا کہ تمام قسم کے رنج و مشقت کی پرواہ کئے بغیر مردانہ وار نبرد آزما رہے۔

چونکہ علامہ فضل حق نے جید عالم دین والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی جو وقت کے مسند امیر تھے۔ خود آپ کے مؤلف کے بقول آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا اور دوسری طرف اسی دلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا۔ طلباء دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔

علامہ فضل حق نے علوم و فنون کے اس سمندر میں غوطہ زنی کر کے لعل و گہر نکالے تھے۔ آپ کے کمال علمی کے جوہر ان مذاکروں اور مباحثوں میں بکھرتے تھے جن میں عقائد و اعمال زیر بحث آتے تھے۔ عقیدۂ امتناع النظیر کے سلسلے میں ان کے مناظرے اور مناقشے شاہ اسماعیل شہید کے ساتھ دیر تک ہوتے رہے۔ واضح دلائل و براہین مولانا کے جوہر علمی لیاقت کا معترف بنا دیتے ہیں۔

مولانا کی صداقت علمی سے متعلق بہت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں ایک شاہد

مولوی رحمان علی کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ۱۸۴۸ء میں ایک دن آپ کی خدمت میں لکھنؤ حاضر ہوا تو علامہ حقہ پیتے اور شطرنج کھیلنے کی حالت میں ایک طالب علم کو افق المبین کا سبق دے رہے تھے اور کتاب کے مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ طالب علم کے ذہن نشین کرا رہے تھے۔

مذکورہ بالا واقعہ اس ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مولانا علم وفن کے اسرار ورموز سے اچھی طرح واقف تھے، کوئی بھی علمی مسئلہ ہو بڑے اطمینان کے ساتھ عمق نظر اور دقت نظری کی زحمتوں کے بغیر بھی چٹکیوں سے حل کر دیا کرتے اور قاری فصاحت ادب اور اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے جیب وداماں کو بھر لیتا ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے مولانا کی دل آویزی کلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا ہے ......
ایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محض عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی، اور امرأ القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی۔"

مولانا کو علوم وفنون میں کمال حاصل تھا، یہ تو مولانا کی خداداد شخصیت کا ایک پہلو ہے اس کا دوسرا اور دلکش پہلو یہ ہے کہ فصاحت وبلاغت اور شگفتگی کلام میں معاصرین کے درمیان اولیت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ انتظام اللہ شہابی کے تجزیے میں یہ بات موزوں اور مناسب معلوم ہوتی ہے کہ معقولات میں تقدم کا شرف حاصل تھا مگر ادبیت جو عربیت کا بڑا جوہر ہے، اس میں وہ کمال حاصل تھا جس کا اعتراف اہل فن کرتے چلے آرہے ہیں۔ عبارتوں میں ایسی ندرت اور شگفتگی ہوتی ہے کہ اس کی مثال علمائے ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد ملنا مشکل ہے

یہ سچ ہے کہ آپ کی فصاحت کلام اور شیریں بیانی میں جہاں خداوند عزوجل

کا جود وکرم شامل حال رہا ہے وہاں حسن تربیت، ماحول اور خود آپ کی محنت شاقہ کو بھی دخل ہے۔ والد محترم کی نابغہ روزگار شخصیت نے آپ کی ذہانت وفطانت پر چار چاند لگا دیئے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تشنگان علم وفن کی طرح علم وفن کے بہتے ہوئے چشموں سے سیرابی بھی حاصل کی۔

علامہ کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے بعض نے ان کی شان میں عالمانہ رفیع زمانہ کے الفاظ کہے ہیں۔ بعض نے حکمت ومنطق میں انفرادیت اور شخص کے مقام سے نوازا ہے اور بعض نے فخر خاندان سے تعبیر کیا ہے۔ علماء اور معاصرین کے سلسلے میں بسا اوقات یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ عقیدت ومحبت کی دیواریں ان کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں اور نتیجتاً غیر جانبدارانہ، غیر مبہم یا عادلانہ رائے سامنے نہیں آتی۔ اس لئے یہ بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی عالم یا ادیب کی شخصیت کی صحیح ترجمانی خود اس کی تخلیقات کی روشنی میں ہوتی ہے اگرچہ وقت کے علماء بالخصوص معاصر علماء اور معاصرین کے بیانات اپنی جگہ شخصیت کے تعارف میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات معروف ہیں

۱۔ الهدية السعيدية في الحكمة الطبيعية۔ پایۂ تکمیل تک ان کے فرزند مولوی عبد الحق نے پہنچایا۔
۲۔ الروض المجود في حقيقة الوجود
۳۔ الجنس الغالي في شرح الجوهر العالي
۴۔ الحاشية على تلخيص الشفا
۵۔ الحاشية على شرح سلم العلوم
۶۔ رسالة في التشكيك في الماهيات
۷۔ الرسالة الغدرية (الثورة الهندية)۔ اس رسالے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مصائب کا دلدوز بیان ہے جو جزیرہ انڈمان کی اسیری کے زمانے میں برداشت کرنے پڑے۔ اس کا اردو ترجمہ مع حواشی باغی ہندوستان کے نام سے چھپ چکا ہے۔

۹۔ الرسالۃ فی تحقیق العلم والمعلوم

۱۰۔ الرسالۃ فی تحقیق الاجسام

مولانا اپنی مذکورہ بالا تصنیفات میں بلاشبہ بڑے پایہ کے مجتہد عالم، فلسفی، متکلم اور محقق نظر آتے ہیں۔ لیکن ان تصنیفات پر اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولانا کے کمال ادب کا اعتراف نہ کیا جائے۔ باغی ہندوستان میں علامہ کے سوانح نگار مولانا آزاد اور علامہ فضل حق کی ادبیت کو کاوش قرار دیتے ہوئے گویا ہیں۔

"شادی و مسرت کا موقع ہو یا حضرت دل کو عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم کے تجربات و تعزیت کا محل ہو یا عبادت و تعزیت کا ہر جگہ اشہب قلم یکساں دوڑتا نظر آتا ہے۔ گویا کہ سامنے وسیع میدان ادب ہے۔ خامہ کو جدھر مہمیز لگاؤ ادھر ہو گیا۔"

چونکہ علامہ آبائی وطن خیرآباد اور آخری وطن دہلی میں ادبی نشستوں اور شعر و شاعری کی مجلسوں سے قدم قدم پر مستفیض ہوئے، اس لئے شعری ذوق بھی نکھرا اور اس میدان میں بھی اپنی ذہانت و مہارت کے جوہر بکھیرے۔ آپکی شاعری فطری ہے۔ کلام میں کہیں اضطراب نہیں ہوتا۔ الفاظ کی بندش موزوں اور مضبوط ہوتی ہے اور تکلفات سے احتراز کرتے ہیں۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر قاری ادبیت کا لطف لیتے ہوئے کلام کے پیچ و خم سے گزرتا چلا جاتا ہے اور اسے کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ علامہ کے ایک عقیدتمند کے بقول جب آپ نے شاعری میں قدم رکھا تو عرب کے ماہرین شعراء سے گویا سبقت لے گئے۔ ان کی نظم چار ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ کئے جائیں۔

خیر الوری و الرحم حقا کاشف عنہم ❊ دفاع ہم فی امر ہم و شفیعہم فی المشہد

ہادی الخلیقۃ مہتد اعلی الخلیقۃ محمد ❊ زاکی الخلیقۃ احمد خیر الانام محمد

ھو دال النور الشمس تیلوہ کل تبیین ❊ شانیہ نہیں بکل عن الحقیقۃ المعتدی

ترجمہ:۔ خیرآباد کا مردم خیز قصبہ، والد، جد کی علمی سرپرستی، مشاہیر علمائے وقت کی خوشہ چینی اور ادبی و علمی مجلسوں میں انہماک، وہ دلچسپی یہی وہ محرکات ہیں جنہوں نے مولانا کی علمی لیاقت کی آبیاری کی۔ یہی وجہ ہے کہ صغر سنی میں ہی علوم و فنون کی مختلف شاخوں پر فتح و تسخیر کی کمندیں ڈال دیں اور تالیفات و تصنیفات کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ چھوڑ دیا جو ایک طرف مولانا کے عمیق مطالعہ اور وسعت فکر و نظر پر دال ہے، تو دوسری طرف مولانا کی ادب شناس شخصیت پر ناطق۔

مراجع و مصادر

۱۔ مولوی رحمان علی مرحوم، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۸۲ طبع اول، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء

۲۔ ایضاً ایضاً ص ۲۸۳ ایضاً

۳۔ علامہ فضل حق خیرآبادی۔ باغی ہندوستان (مترجم) ص ۲۱ طبع اول ۱۹۴۷ء

۴۔ مولوی رحمان علی مرحوم۔ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۲۸۳ ۱۹۶۱ء کراچی

۵۔ سر سید احمد خاں۔ آثار الصنادید ص ۵۹۲ طبع چہارم ۱۹۶۵ء

۶۔ انتظام اللہ شہابی۔ مولانا فضل حق و عبدالحق ص ۱۰۹ نظامی پریس بدایوں

۷۔ نواب صدیق حسن خاں ابجد العلوم ص ۹۱۵ ۱۲۹۶ھ بھوپال۔

۸۔ علامہ عبدالحی الحسنی۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۰۳ ج ۷ طبع اول ۱۹۵۹ء

۹۔ سر سید احمد خاں۔ آثار الصنادید۔ ص ۵۹۲ طبع چہارم ۱۹۶۵ء

۱۰۔ تصنیفات کی یہ فہرست اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ص ۱۵۲ سے ماخوذ ہے۔

۱۱۔ علامہ فضل حق خیرآبادی۔ باغی ہندوستان ص ۹۸ (مترجم) طبع اول ۱۹۴۷ء

۱۲۔ انتظام اللہ شہابی۔ مولانا فضل حق و عبدالحق۔ ص ۱ نظامی پریس بدایوں

۱۳۔ علامہ فضل حق خیرآبادی۔ باغی ہندوستان (مترجم) ص ۹۸ طبع اول ۱۹۴۷ء

تحریر: محمد قطب - استاذ جامعہ ام القریٰ - مکہ
ترجمہ: محمد مسیح الرحمان صدیقی - مدینہ منورہ

تیسری قسط

لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم

قرآن نے لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ صرف بتوں کی پرستش سے ہی نہیں بلکہ شرک کی تمام قسموں سے اور یکساں اہمیت کے ساتھ ذہن و دماغ، احساسات و سلوک کو چھٹکارا دلانے کی سعی کی ہے اور مکہ میں حکم خداوندی اور اس کی تعلیمات کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد ان تمام محاذوں پر جاری تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مشرکین مکہ سے خطاب کرتے ہوئے زندگی بعد موت اور جواب دہی کے بیان پر قرآن کا خاصا حصہ پھیلا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے باخبر ہے کہ دلوں سے شرک اور اس کے آثار مٹانے میں عقیدۂ آخرت کتنا مؤثر ہے جب تک انھیں زندگی بعد موت پر مکمل ایمان نہ ہو اور حشر کا دن، اعمال پر حساب و کتاب کا یقین کامل نہ ہو اس وقت تک شرک کی نجاستوں سے پاک نہیں ہو سکتے خواہ یہ شرک بندگی میں ہو یا افکار کی فرمانبرداری میں

اور جب لا الٰہ الا اللہ کے نور نے مومنین کے دلوں سے شرک کی ان تمام قسموں کو مٹا دیا تو ان میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ گویا انھوں نے رزم گاہ حیات میں آج ہی قدم رکھا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے لا الٰہ الا اللہ کا تقاضہ جس انداز میں سمجھا اس کی تصدیق کر دی ہے نہ کہ زبان سے صرف اس کا اقرار کر لیا جائے۔

پہلی اور دوسری قسط [illegible] اگست ۱۹۸۰ء، دسمبر ۱۹۸۰ء کے مشترکہ شمارہ میں اور [illegible] اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۱ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہو چکی ہیں۔

بلکہ اس کلمہ کا اثر ان کی ذات پر اس طرح ہوا جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے علاوہ بھی ذکر کیا ہے، کہ ایک نئے طریقہ پر شخصیت کی تعمیر ہوئی جس طرح ذرات کی ایک خاص ترتیب سے لوہے کے ٹکڑے میں مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس ہدایت حق نے ان کی زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اور زبردست اثر ڈالا۔

یہ روشنی ہی ایسی تھی جس نے ان کے دل و دماغ، فکر و خیال اور عملی زندگی میں جھوٹے خداؤں کی ظلمت کو مٹا دیا پھر ان کا دل و دماغ ایک ہی لاشریک معبود کا ہو کر رہ گیا، بندگی اور ہر بندگی اسی خدائے واحد کے لئے ہو کر رہ گئی۔

آباؤ اجداد کی تقلید، جاہلی رائے عامہ[1]، معاشرتی عادات اور موروثی معتقدات کی گرفت کے پر کے برابر بھی حیثیت نہ رہی، چونکہ یہ چیزیں انسان کے احساسات اور خیالات کا محور نہیں تھیں رشتوں اور مصلحتی تقاضوں میں اب وہ قوت باقی نہ رہی کہ اس کے سبب یہ ایک جگہ اکٹھے ہوں اور یہی وجہ تفرقہ ہے۔

اور ان کی بنیادیں، یہ وہ اثر تھا جو لا الٰہ الا اللہ والی زندگی قبول کرنے سے پہلے رکھتی تھیں، اب ایسی قدروں اور خیالات کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی جس میں دنیا کا رشتہ آخرت سے توڑ دیا گیا ہو۔

اب لا الٰہ الا اللہ ہی محبت و دشمنی کی اساس تھا، یہی مومنوں کے دلوں کو جوڑنے کا سبب تھا اور اسی کی بنیاد پر تفریق کی دیوار قائم ہوتی تھی۔ اب اجتماع و اتحاد کا سرچشمہ بھی لا الٰہ الا اللہ تھا اور اس کے وجود کی شان بھی لا الٰہ الا اللہ پر تھی۔

پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انھیں لا الٰہ الا اللہ کی ہدایت کر رہے تھے اور جن کی ذات رسالت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ دراصل یہ تاریخ انسانی کا سب سے عظیم کام کر رہے تھے وہ یہ کہ اس بگاڑ روزگار جماعت کی ترتیب لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کے مطابق کر رہے تھے

---

[1] اس وقت ہمارے زمانے میں اسے رائے عامہ کہتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ لے

ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے یعنی قرآن، اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

تو اب ان مومنوں، پرہیزگاروں اور فلاح پانے والوں کے اوصاف میں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصدیق و اقرار کی شرط پوری کی بلکہ اس کے ساتھ اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ بھی کیا۔ یہی دونوں عبادتیں اس وقت تک فرض ہوئی تھیں۔

گویا ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ بس اتنا ہی کافی ہے کہ تم نے مطلوب کی ادائیگی کر دی یا یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ اور وہ جو کچھ بھی اللہ نے تم پر فرض کیا ہے ان میں سے ہر ایک کی ادائیگی ضروری ہے جو اختیاری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ذہن نشین کرایا جا رہا ہے کہ حقیقت ایمانی صرف تصدیق و اقرار سے حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کے ساتھ مطلوبہ اعمال کی ادائیگی بھی ضروری ہے جو ایمان کی علامت میں کہا جا رہا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

ترجمہ: نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو

لے سورۃ البقرہ (۱ — ۵)

اور خلافیات لا الٰہ الا اللہ سے ان کی زندگیوں کو سنوار رہے تھے، وہاں بے مثال تربیت کے نتیجے میں بے مثال امت سامنے آئی۔

بہت سے لوگوں کا گمان یہ ہے کہ اس وقت جو افراد سامنے تھے وہ پہلے چونکہ مشرف تھے ان کے لئے یہ مقتضیات لا الٰہ الا اللہ بہ کم قدر وارد ہو گیا، اور اس جماعت پر اس کے سارے اثرات ظاہر ہو گئے۔ ورنہ اگر صورت حال مختلف ہوتی تو مطلوب لا الٰہ الا اللہ کا صرف اقرار و تصدیق ہوتا۔

یہ بہت بڑا نقصان تھا جو رجحان فکر کے ہاتھوں امت اسلامیہ کو اٹھانا پڑا اور جس نے دوسرے محرکات کے ساتھ مل کر برابر لا الٰہ الا اللہ کی روح کو اس کے جسم سے جدا کرنے کی کوشش جاری رکھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آخر یہ کلمہ اپنی روح سے خالی ہو گیا۔

اس غلط فہمی پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کی جو عملی صورت مدینہ منورہ میں تحقیق کے ساتھ پیش کر دی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ پر خصوصی توجہ (جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے) مدینہ میں بھی برابر قائم رہی۔ اس لئے کہ یہ بات حقیقتاً ایسی تھی ہی نہیں کہ سرسری طور پر دوران گفتگو اس کا تذکرہ آ جائے پھر رخ کسی دوسری سمت پرواز کرنے لگے۔ بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ حقیقت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ابتدا اسی سے ہو اور گفتگو کے تمام مراحل کے باوجود اس مرکزی محور سے ہٹنے نہ پائے۔

مثال کے طور پر مدنی سورتوں کے یہ چند نمونے ہیں جن سے اس نکتہ پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

سورۃ بقرہ جو متعدد موضوعات پر مشتمل ہے جن میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کے رہنما تنظیمی اصول بیان کئے گئے ہیں، اس کی ابتدا ان مومنوں کے ذکر سے کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے اعتقاد درست کر لئے ہیں، مطلوبہ موقف پر ثابت قدم ہو چکے ہیں اور ان عبادات کی ادائیگی پر قائم ہیں جو ان پر فرض کی گئی ہیں۔

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ

ترجمہ: الف، لام، میم، یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں

والملٰئكة والكتٰب والنبيّن
وآتى المال على حبّه ذوي
القربٰى واليتٰمٰى والمسٰكين
وابن السبيل وفي الرقاب
وأقام الصلٰوة وآتى الزكٰوة
والموفون بعهدهم إذا
عٰهدوا والصٰبرين في البأساء
والضرّاء وحين البأس أولٰئك
الذين صدقوا وأولٰئك هم
المتّقون

اور یومِ آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی
ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے
مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند
مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور
مسافروں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے
والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے
نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ
لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں۔
اور تنگی، مصیبت کے وقت میں اور حق
باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہی ہیں راستباز
لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔[1]

اور سورۂ آل عمران جو تمام کی تمام اللہ کے مسئلہ پر گفتگو کرتی ہے۔ اور جس کی ابتدا ہی ان
آیات سے ہوتی ہے جن کا عقیدۂ توحید سے گہرا ربط ہے۔

الٓمّٓ ۔ اللہ لا الٰہ الا ھو الحیّ
القیوم نزّل علیک الکتٰب
بالحق مصدقا لما بین یدیہ
وانزل التورٰۃ والانجیل من قبل
ھدًی للناس وانزل الفرقان

الٓمّ۔ اللہ زندۂ جاوید
ہستی جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے
ہے حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔
اسی نے (اے نبی) تم پر یہ کتاب نازل
کی جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی
تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔
اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے

[1] اگر تفصیل چاہیں تو "درساتِ قرآنیہ" دیکھیں۔ [2] سورۂ آل عمران (۱ ـ ۴)

تورات و انجیل نازل کر چکا ہے اور اب یہ
وہ کسوٹی اتاری ہے، جو حق اور باطل کا فرق
دکھانے والی ہے۔[2]

یہ سورۃ جہاں عقائد کو دو ٹوک انداز میں بیان کرتی ہے، کتاب کے ساتھ عقائد کے تقاضوں کو بھی ظاہر
کرتی ہے۔ اور انہی تقاضوں کے ضمن میں جہاد کا مسئلہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ جن عقیدوں کو تسلیم
کیا گیا ہے انھیں اپنی زندگیوں میں نافذ بھی کیا جائے۔ اور اسی میں عظیم ترین ترقی کا راز ہے۔

"إن في خلق السمٰوٰت والأرض
واختلاف الليل والنهار لآيٰت
لأولي الألباب ۔ الذين يذكرون
الله قيامًا وقعودًا وعلى جنوبهم
ويتفكرون في خلق السمٰوٰت
والأرض ربنا ما خلقت هٰذا
باطلًا فقنا عذاب النار ۔
ربنا إنك من تدخل النار
فقد أخزيته وما للظٰلمين
من أنصار ۔ ربنا إننا سمعنا
مناديًا ينادي للإيمان أن
آمنوا بربكم فآمنّا ربنا فاغفر لنا
ذنوبنا وكفّر عنا سيّئاتنا وتوفّنا
مع الأبرار ربنا وآتنا ما وعدتنا

زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات
دن کے باری باری آنے میں ان ہوش
مندوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو
اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا
کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمان کی
ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے
اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار، یہ
سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں
بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث
کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ
کے عذاب سے بچا لے، تو نے جسے دوزخ
میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت
و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے
ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اے

[1] سورۂ آل عمران (۱۹۰ ـ ۱۹۵)

یہ سچے مومن جو اٹھتے، بیٹھتے اور ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ یاد و فکر قلب ہے بلا انحراف ان سے بھی، آسمان و زمین کی تخلیق کے بارے میں غور کرتے ہیں ان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ تخلیق وہی باطل کارخانہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کا وجود برحق ہے، اور اس حق کا تقاضا ہے کہ انسانوں سے ان کے اعمال پر باز پرس ہو جو انھوں نے دنیا میں رہتے ہوئے کیے ہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ موت کے بعد ایک اور زندگی ہو جس میں کارکردگی کے مطابق سزا و انعام کا فیصلہ ہو۔ لہٰذا وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں دوزخ سے بچائے اور بہشت میں داخل کرے۔ وہ اپنی خوش قسمتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں ایمان کی دعوت دینے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز کانوں تک پہنچی، ایمان لے آئے۔ یہ مومنین جن کی یہ علامت و صفت بیان کی گئی تھیں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دعا کس بنا پر مقبول ہوئی؟ کیا اس کی بنیاد صرف تصدیق و اقرار ہے؟ کیا اس کی بنیاد محض تدبیر و تفکر ہے؟ کیا اس کی وجہ ذکر ہے؟ کیا دوزخ سے نجات اور حصول جنت کے لیے محض عاجزانہ دعا اس کی بنیاد ہے؟ یا ان سب کے بعد کوئی چیز اور ہے جو ان سب کا تقاضا ہے؟

فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم

ترجمہ: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔

ترتیب بالکل واضح ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ جو چیز مطلوب ہے وہ عمل ہے جس کی بنیاد پر اللہ نے شرف قبولیت بخشا ہے وہ یہ ہے کہ تفکر، تدبر اور ذکر، ساری چیزیں عمل کی شکل اختیار کریں۔ چونکہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی اور حق کی خاطر جہاد کے مسئلے پر بحث کرتی ہے لہٰذا اس موقع کی مناسبت سے چند اعمال کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے، چنانچہ ذکر ہے ان کا جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑ دیا، جنھیں خدا کی راہ میں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا، جنہیں اللہ کی راہ میں اذیت دی گئی، جنھیں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا گیا۔ ان آیات میں ان سے جزا کی

على رسلك ولا تخزنا يوم القيامة، إنك لا تخلف الميعاد فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى، بعضكم من بعض، فالذين هاجروا وأخرجوا من ديارهم وأوذوا في سبيلي وقاتلوا وقتلوا لأكفرن عنهم سيئاتهم، ولأدخلنهم جنات تجري من تحتها الأنهار ثوابا من عند الله، والله عنده حسن الثواب۔" (لہ)

ہم نے ایک پکارنے والے کو جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انھیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے خدا، جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

جواب میں ان کے رب نے فرمایا، میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کر دوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔

لہ سورۃ آل عمران (۱۹۰ — ۱۹۵)

کو استوار کر سکیں، اور یہی مرجع اور یہی سند کی نشاندہی کی جاتی ہے جس کی طرف سے تمام معاملات میں رہنمائی حاصل کرنا ہے۔

يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولي الامر منكم فان تنازعتم في شيء فردوه الى الله والرسول ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر (ك)

ترجمہ: "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

چنانچہ تمام معاملات کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دینے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے مربوط کیا گیا ہے۔ اور اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے۔

ان كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر۔

اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

پھر انھیں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صرف تبلیغ و اعلان کے لئے نہیں بھیجے کہ کوئی بس اتنا کہہ دینا کافی ہو کہ بات ہم تک پہنچ گئی، معلوم ہوا اور ہم نے تصدیق و اقرار کر لیا، بلکہ ان کے بھیجے جانے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی اطاعت و پیروی کی جائے۔

"وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله (ك)

ترجمہ: ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

ك سورۃ النساء (۵۹) ك سورۃ النساء (۶۴)

کے بیان کرنے کی غرض یہ نہیں ہے کہ یہی دراصل مطلوب ہیں بلکہ اس سے ذرا اوپر کی آیات پر انہیں اعمال کا ذکر مناسب تھا۔

اسی طرح سورۃ نساء میں "اے مومنو!" کہہ کر انھیں پھر ان ہی الفاظ سے ایمان لانے کو کہا جاتا ہے جن پر فی الحقیقت وہ پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ جب تم مطلوبہ ایمان لا چکے اس میں پختگی آ گئی، اس کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئے، تمہارے شعور و احساس میں یہ پیوست ہو گئے اور تم تصدیق و اقرار کر چکے تو پھر جو چاہو کرو، تمہاری عملی زندگی اور کاروبار یا تمہاری خواہشات کے تابع ہو جائیں یا عرف و رواج کے مطابق زندگی گزارو۔۔۔۔ بلکہ ان سب کے بعد ان پر کچھ فرائض عائد کئے جاتے ہیں اور سلسلۂ بیان یوں ختم ہوتا ہے۔

تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات تجري من تحتها الانهار خالدين فيها وذلك الفوز العظيم۔ ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين (ك)

ترجمہ: "یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائیگا اسے اللہ آگ میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن سزا ہے۔"

اور انھیں کچھ متعین ہدایات اجمالی بھی دی گئی ہیں کہ وہ اپنے معاشرتی اور اجتماعی تعلقات

ك سورۃ النساء (۱۳ - ۱۴)

يا ايها الذين آمنوا اوفوا بالعقود ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے وعدے پورے کرو۔

یہی وہ سورۃ ہے جس میں بالکل واضح طور پر دوسری تمام شریعتوں کو چھوڑ کر صرف خدائی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی دو ٹوک انداز میں بتا دیا گیا ہے "قانون" کی صرف دو قسمیں ہیں۔ کوئی تیسری قسم نہیں اور نہ ان دونوں کے درمیان رابطہ ہے۔

۱۔ اللہ کا قانون یا (۲) جاہلیت کا قانون۔

افحكم الجاهلية يبغون ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون ۝ ۱

ترجمہ: (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

اور جنہوں نے اللہ کے نازل کردہ احکام کے برعکس فیصلہ کیا ان کی حیثیت اللہ کے نزدیک کافر، فاسق اور ظالم کی ہے۔

ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون ۝ ۲

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون ۝ ۳

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الفاسقون ۝ ۴

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

---

۱ سورۃ المائدہ (۵۰) ۲ سورۃ المائدہ (۴۴) ۳ سورۃ المائدہ (۴۵)
۴ سورۃ المائدہ (۴۷)

پھر اوامر و نواہی کے احکام اور توجیہات بیان کرنے کے بعد جو پہلے سے ہی ایمان لائے ہوئے ہیں انہیں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایمان، تمنا اور خواہش کا نام نہیں بلکہ ایمان نام ہے اس حقیقی تصدیق کا جس کا عملی طور پر محسوس کیا جائے۔

ليس بامانيكم ولا اماني اهل الكتاب من يعمل سوءا يجز به ولا يجد له من دون الله وليا ولا نصيرا ومن يعمل من الصالحات من ذكر او انثى وهو مؤمن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا ۝ (۵)

ترجمہ: انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پائے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔"

اور سورہ مائدہ میں، دین کی تکمیل اور اتمام نعمت کا اعلان کیا گیا۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا ۝ ۶

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

یہ پوری سورۃ کھانے پینے کی اشیاء اور معاملات اور احکام کی حلت و حرمت سے بحث کرتی ہے۔ اور پوری سورۃ کا خطاب ان لوگوں سے ہے جو پہلے سے ایمان لائے ہوئے ہیں چنانچہ سورۃ کی ابتداء ہی یوں ہے:

---

۵ سورۃ النساء (۱۲۳ تا ۱۲۴) ۶ سورۃ المائدہ (۳)

یہی حال مجموعی طور پر و بھی تمام مدنی سورتوں کا ہے۔ دوسرے تحتی ان تمام سورتوں کا نہی روئے سخن ان کی طرف ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔ اقرار و تصدیق کے مرحلے سے گذر چکے ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اقرار و تصدیق جسے ہجرت فی سبیل اللہ کے ساتھ کرنے کا کہتے ہیں۔ ہجرت بجائے خود ایک عمل تھا جس کا انھیں حکم دیا گیا اور پھر جسے انھوں نے پورا کر دیا) یا انصار مدینہ جس چیز پر عمل پیرا تھے۔ ان سب کے لئے ضروری ہے کہ دین میں جن احکام، ذمہ داریوں اور اوامر و نواہی کا حکم ہوا ہے ان پر عمل کا رجحان ہو، اور ان کا ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جب تمام نازل کردہ چیزوں پر عمل ہو۔ وہی عمل ایمان میں سچائی کی دلیل ہوگی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہوگا نفاق ہوگا، جو اللہ قبول نہیں کرتا۔ اور نفاق کی سزا جہنم کے نچلے درجہ میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہوگا۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد أمروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیدا ..... فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ۝ (۱؎)

ترجمہ: اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے ..... نہیں اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے

جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

ویقولون آمنا باللہ وبالرسول واطعنا ثم یتولی فریق منھم من بعد ذلک وما اولئک بالمؤمنین ۝ واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون ۝ وان یکن لھم الحق یأتوا الیہ مذعنین ۝ أفی قلوبھم مرض أم ارتابوا أم یخافون أن یحیف اللہ علیھم ورسولہ بل اولئک ھم الظالمون ۝ انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم أن یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون ۝ ومن یطع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک ھم الفائزون (۱؎)

ترجمہ: یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمہ کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔ البتہ حق اگر ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آ جاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔ ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمہ کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا

اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں اور کامیاب وہی لوگ ہیں جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

إن المنافقين في الدرك الأسفل من النار ولن تجد لهم نصيرا ؎	ترجمہ: یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

مدنی سورتوں میں اس طرح لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کو بیان کیا گیا اور دین کی تکمیل کے وقت یہ اعلان ہوا کہ:

؎ اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا	ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

تو اس وقت جو ہمارا دستور زندگی تھا اس کے دائرہ میں اعتقادات، عبادات، معاملات سبھی کچھ تھے۔ اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد، اس کی ذات، صفات، اسماء و افعال میں، تمام عبادتوں کا بلا شرکت غیرے اسی کے لئے ہونا، تمام دستوروں کو چھوڑ کر صرف اسی کے دیئے ہوئے دستور کو نافذ کرنا، اللہ کی اخلاقیات سے اپنی ذات کو سنوارنا، یہ اور دوسری تکالیف جن کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔

اسی طرح مکی سورتوں میں عقائد سے متعلق ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، ملائکہ، کتاب اور نبیوں پر ایمان اور ان عبادتوں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے، جو مکہ میں فرض ہو چکی تھیں، تو مدنی سورتوں میں حاکمیت کے مسئلہ، شریعت الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کے وجوب اور اس کو ایمان میں کمال کی صفت قرار دینے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقی

؎ سورۃ النساء (۱۴۵)

اور ان دوسری عبادتوں پر بھی زور دیا گیا ہے جو مدینہ میں فرض کی گئیں۔

یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ حاکمیت کا مسئلہ اپنی تفصیلات کے ساتھ: یعنی حاکمیت کا صرف اللہ کے لئے ہونا اور حلال و حرام، جائز و ناجائز کا دستوری حق صرف اللہ کے لئے اس طرح خاص ہو کہ اس میں کوئی انسان شریک نہ ہو، جو یہ خدا کے فرمان سے ہٹ کر قانون سازی کرے اور ان لوگوں کی پیروی کرنا جو خدا کے فرمان کے خلاف فیصلے کرتے ہیں شرک ہے) مدینہ میں اس وقت طے ہوا جب احکام کا نزول شروع ہوا، کہ مسلمان اپنی زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر استوار کریں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ واضح اور قطعی طور پر ایک ساتھ مکی سورتوں میں اخلاقی پابندی کی بجائے عقیدہ لا الٰہ الا اللہ کی ایک اساس کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

مثال کے طور پر مکی سورۃ الاعراف کی یہ آیت:

اتبعوا ما أنزل إليكم من ربكم ولا تتبعوا من دونه أولياء قليلا ما تذكرون ؎	ترجمہ: جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت سے کیا معلوم ہوا؟

یہ آیت بتا رہی ہے کہ انسان کی دو حالت ہے، ایک وہ جس کا اسے حکم دیا گیا ہے، دوسری وہ جس سے اسے روکا گیا ہے، پہلی حالت ایمان کی ہے اور دوسری کفر کی۔

اتبعوا ما أنزل إليكم من ربكم ایمان کا خلاصہ ہے۔

اور اس کے بالمقابل اس کی پیروی کرنا جو خدا کا نازل کردہ نہیں ہے، یعنی شرک کا اتباع کرنا شرک ہے۔ سورۃ اعراف کی ہی دوسری آیت ہے۔

؎ سورۃ الاعراف (۳)

الا له الخلق والامر ؕ	ترجمہ: خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

آیت کے اس ٹکڑے سے بیک وقت دو باتیں ثابت ہو رہی ہیں۔

حاکمیت خالصتاً اللہ کے لئے ہے۔ اور یہ حاکمیت زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ اسی کی حاکمیت آسمان و زمین اور حیات انسانی میں کارفرما ہے۔ آسمان و زمین میں اس کی حاکمیت کے بارے میں آیت کے اسی جملے سے پہلے بیان ہوا ہے۔

ان ربکم اللّٰہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یغشی الیل النہار یطلبہ حثیثا والشمس والقمر والنجوم مسخرٰت بامرہ ؕ	ترجمہ: درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج، چاند اور تارے پیدا کئے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔

اور حیات انسانی میں اس کی حاکمیت کا ثبوت اسی آیت کی بعد والی آیات میں بیان ہوا ہے۔

ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ انہ لا یحب المعتدین ٭ ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا ؕ	ترجمہ: "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح

لے سورۃ الاعراف (۵۴) لے سورۃ الاعراف (۵۴) لے سورۃ الاعراف (۵۵-۵۶)

ہو چکی ہے۔

یعنی خدا سے باغی ہو کر سرکشی مت کرو۔ اور خدا کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پیروی کر کے زمین میں فساد کا سامان مت کرو۔

اسی آیت سے جو دوسری چیز ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ وہی آسمان و زمین اور انسانی زندگی کا خالق ہے۔ لہٰذا حکمرانی بھی اسی کا حق ہے۔ جو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے حکمرانی اسی کی چلتی ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا وہی تنہا آسمان و زمین اور حیات انسانی میں حکمران ہے۔

سورۃ الشوریٰ (مکی) میں ارشاد ہے۔

وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللّٰہ ذٰلکم اللّٰہ ربی علیہ توکلت والیہ انیب (لہ)	ترجمہ: تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔"

یہ آیت بھی اسی بنیادی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہ یہ کہ: انسانی زندگی کے پیش آمدہ تمام معاملات میں اللہ کی حکمرانی تسلیم کرے۔ آیت میں (من شیء) کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں اس کی حکمرانی اس طرح تسلیم کی جائے کہ کوئی بھی معاملہ اس کی فرمانروائی کے دائرہ سے باہر نہ ہو۔ حلال ہو یا حرام، مباح ہو یا مکروہ یا مستحب ان میں سے ہر ایک میں مطلقاً اسی کا حکم نافذ ہو۔ اور یہی بات گزشتہ آیت سے بھی واضح ہوتی ہے جو سورۃ الاعراف والی آیت سے ثابت ہوتی ہے۔

ام اتخذوا من دونہ اولیاء	ترجمہ: کیا یہ (ایسے نادان ہیں کہ)

لے سورۃ الشوریٰ (۱۰) سورۃ الشوریٰ (۱۱)

فالله هو الولي وهو يحيي الموتى وهو على كل شيء قدير ۔

کیا انہوں نے اسے چھوڑ کر دوسرے حامی بنا لیے ہیں۔ ولی تو اللہ ہی ہے۔ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

تو معلوم ہوا کہ ہر معاملہ میں اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنا ہی ایمان ہے۔ اور خدا کے سوا دوسروں کا سہارا لینا شرک ہے۔ جو ایک باطل عمل ہے۔ اس لئے کہ تنہا اللہ ہی مددگار ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی طرح سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے۔

أم لهم شركاء شرعوا لهم من الدين ما لم يأذن به الله ۱

ترجمہ: ”کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔“

لیکن اس قضیہ پر سورۃ انعام کی آیتیں زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں۔

أفغير الله أبتغي حكما وهو الذي أنزل إليكم الكتاب مفصلا والذين آتيناهم الكتاب يعلمون أنه منزل من ربك بالحق فلا تكونن من الممترين وتمت كلمة ربك صدقا وعدلا لا مبدل لكلماته وهو السميع العليم ۔ وإن

ترجمہ: پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں۔ حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل

---

۱ سورۃ الشوریٰ (۲۱)

تطع أكثر من في الأرض يضلوك عن سبيل الله إن يتبعون إلا الظن وإن هم إلا يخرصون ۔ إن ربك هو أعلم من يضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين ۔ فكلوا مما ذكر اسم الله عليه إن كنتم بآياته مؤمنين ۔ وما لكم ألا تأكلوا مما ذكر اسم الله عليه وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه وإن كثيرا ليضلون بأهوائهم بغير علم إن ربك هو أعلم بالمعتدين ۔ وذروا ظاهر الإثم وباطنه إن الذين يكسبون الإثم سيجزون بما كانوا يقترفون ۔ ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وإنه لفسق

نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اور اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین پر بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ درحقیقت تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں۔ ان حد سے گزرنے والوں کو

وإن الشياطين ليوحون
إلى أوليائهم ليجادلوكم
وإن أطعتموهم إنكم
لمشركون ۱

تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ، یہ کھلا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کرلی تو یقیناً تم مشرک ہو۔

ان آیات کی ابتداء

افغیر اللہ ابتغی۔

یہ اسلوب بیان اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے۔ حکم بنائے جانے کے لائق وہی ہے، اس کے علاوہ کوئی اس لائق نہیں ہے کہ جسے کسی بھی معاملہ میں حکم مانا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں احکامات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ پھر اس کے بعد کسی کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ کسی بھی معاملہ میں خدا کے علاوہ اور کسی کو حکم مانے۔ خیال رہے کہ یہ ایک مکی سورۃ کی آیتیں ہیں اور مکہ میں ابھی تک وہ تمام شرعی دفعات نازل نہیں ہوئی تھیں جن کی انسانی زندگی میں ضرورت پیش آتی ہے۔ شریعت اپنی تفصیل کے ساتھ مدینہ میں نازل ہوئی۔ آیت میں جس تفصیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سے احکام یعنی فروعی مسائل کی تفصیل مراد نہیں ہے بلکہ سب سے اہم مسئلہ یعنی مسئلہ حاکمیت کی تفصیل مراد ہے۔ بتانا مقصود ہے کہ یہ مسئلہ عقیدہ کا بنیادی مسئلہ ہے، نیز یہ کہ عقیدہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی اور نہ اس میں درستگی آ سکتی ہے جب تک کہ اصولی طور پر ان تمام چیزوں کی اور پیروی نہ کی جائے جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ، تھوڑا ہو یا زیادہ، جس کا تعلق اعتقاد

---

۱ سورۃ الانعام (۱۱۹ — ۱۲۱)

ہو یا اخلاق سے یا احکام سے۔

پھر اگلی آیات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ فرمان خداوندی ہی صرف آخر ہے اور یہی صدق و عدل ہے اور اس کی پیروی نہ کرنے والے گمراہ ہیں جو ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے راہ راست نہیں پاتے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گئے اور کون اس کی راہ پر لگے۔

پھر ان آیات کی تمہید کے بعد اصل قضیہ بیان ہو رہا ہے اور وہ ہے حلال و حرام کا قضیہ اور یہ کہ اس میں کس کا حکم نافذ العمل ہے۔ اور یہ کہ اس میں ایک مومن اور مشرک کا موقف کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ کیا چیز ہے جو اس معاملہ میں انسان کو مومن اور دوسرے کو مشرک قرار دیتی ہے۔ اس مناسبت سے قریب یہ ہے کہ مشرکین کے مردار جانوروں پر "اللہ کا نام" نہیں لیتے تھے لیکن اس کے کھانے کو حلال قرار دیتے تھے۔ اور اس عمل کو اپنی طرف سے درست قرار دیتے، جبکہ اس عمل کے لئے اللہ کی طرف سے حکم تھا نہ دلیل تھی تو اللہ مومنوں کو ان جانوروں کے کھانے سے منع کر رہا ہے جو اللہ کے نام پر ذبح نہ کئے گئے ہوں، انھیں مراد ہیں جن کا کھانا اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اور انھیں خبردار کرتا ہے کہ اگر انھوں نے مشرکوں کا عمل اختیار کیا تو وہ بھی مشرکوں جیسے قرار پائیں گے۔ اس لئے کہ مشرکین اس جاہلی قانون کے پیروکار ہیں جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حاکمیت کا قضیہ مدینہ میں نزول شریعت کے بعد نہیں شروع ہوا بلکہ حقیقتاً یہ مکی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب کہ دین عقیدہ کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں اور لا الہ الا اللہ کے تقاضوں کو بیان کیا جا رہا تھا، اور اس کے بعد مدینہ میں قطعی احکام نازل ہوئے جو اس بات کی مزید تکمیل کے لئے تھے کہ اب جو بھی فرمان خداوندی کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے، اور کسی کو اس وقت تک مومن شمار نہیں کیا جائے گا تا آنکہ وہ خدا و رسول کے فرمان کے مطابق فیصلہ قبول نہ کرے کہ یہی عقیدہ کی بنیاد رکھتے وقت جو طے کر دیا گیا ہے یہ اسی کی تصدیق اور مضبوطی کے لئے ہے۔

تو یہ تو امر ربانی ہے پھر ذرا یہ دیکھیں کہ انھوں نے اسے عمل زندگی میں کیسے ڈھالا، اس حکم الٰہی کی پیروی کس طرح کی، اور کیسے انھیں نافذ کیا۔ ان یگانۂ روزگار جماعت کے کسی فرد کے ذہن میں ایسی کوئی الجھن پیدا ہی نہیں ہوئی کہ وہ یہ پوچھنے لگتا کہ تمام امر ربانی جو قرآن یا حدیث میں آئے ہیں سب کی پابندی لازمی ہے؟ کیا ان اوامر کی لازمی پابندی ایمان کا جزء ہے؟ اور کیا کوئی انسان کوئی عمل کئے بغیر بھی مومن ہو سکتا ہے؟

کسی نے اس طرح نہیں سوچا، چاہے وہ مومن رہے ہوں جن کے ایمان کی گواہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، یا وہ دوسرے حتیٰ کہ ان منافقین نے بھی اس طرح نہیں سوچا جو ایمان کا مظاہرہ تو کرتے تھے مگر درحقیقت کافر تھے۔

اس لئے کہ یہ دونوں طبقے اچھی طرح جانتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ ایک محض ایسا کلمہ نہیں کہ جس کو زبان سے پڑھ لیا اور بات ختم ہوگئی۔ بلکہ یہ ایسا کلمہ ہے جس کے کچھ تقاضے ہیں اور عملاً ان تقاضوں کو وہ پورا بھی کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ مومنین اور منافقین کے عمل کے درمیان جوہری فرق تھا۔ مومنین تو ان اوامر کی ادائیگی کو ایمان کا تقاضا سمجھتے، اللہ کی اطاعت کے جذبے کے ساتھ ان چیزوں کو ادا کرتے۔ جنت اور اس کی رضا کی طلب ہوتی۔ جبکہ منافقین ایمان کے بغیر محض دکھاوے کی خاطر ایسا کرتے۔ سستی اور بے دلی کے ساتھ کرتے اور کاہلی سے راہ فرار کا حیلہ تلاش کرتے۔

ان المنافقين يخادعون الله وهو خادعهم، واذا قاموا الى الصلوٰة قاموا كسالىٰ يراءون الناس ولا يذكرون الله الا قليلا [1]

ترجمہ: "یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔"

---

[1] سورۃ النساء (۱۴۲)

وان منكم لمن ليبطئن فان اصابتكم مصيبة قال قد انعم الله علي اذ لم اكن معهم شهيدا. ولئن اصابكم فضل من الله ليقولن كان لم تكن بينكم وبينه مودة يا ليتني كنت معهم فافوز فوزا عظيما [1]

ترجمہ: "ہاں تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چراتا ہے اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔"

مومن تو کیا کوئی منافق بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ صرف زبان سے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینے سے اس کا شمار دنیا میں مسلمانوں کی جماعت میں ہو سکتا ہے جبکہ اس کلمے کے ایک تقاضے کو پورا نہ کیا ہو۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

مسلم معاشرہ ایسا معاشرہ جس میں شریعت کی حکمرانی ہو، میں کسی ایسے فرد کا تصور محال ہے جو مسلمان کہلائے اور اس پر اصرار بھی کرے۔ (خواہ حقیقت میں وہ مومن ہو یا منافق) لیکن اس کا ایک عمل بھی اسلامی عمل نہ ہو۔

مثال کے طور پر نماز کے ہی معاملہ کو سامنے رکھیں۔

مسلم معاشرہ (جس میں شریعت الٰہی کے مطابق فیصلے ہوں) میں کوئی شخص لگاتار تین دنوں کی نمازیں نہ پڑھنے کی صورت میں قتل کی سزا سے بچ نہیں سکتا، یہ قتل خواہ کفر کی بنا پر ہو یا ترک صلوٰۃ پر جیسا کہ ہے، مگر اس قتل میں عبرت آموزی کا کوئی پہلو نہیں

---

[1] سورۃ نساء (۷۲ — ۷۳)

(اس لئے کہ عبرت، جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے درست کہا ہے، عملی زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو اور وہ قتل گاہ کی طرف اس لئے بڑھ رہا ہو کہ وہ تارک صلوٰۃ ہے اور پھر ترک صلوٰۃ پر اصرار کے جرم میں حقیقتاً قتل بھی کر دیا جائے) بلکہ یہاں بھی شریعت الٰہی کی حاکمیت کا عملی اقرار ہے۔ دوسرے تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف خدائے واحد کی شریعت کے مطابق فیصلہ لینے کا عہد ہے۔ ورنہ مسلم معاشرہ میں شریعت سے باغی ہو کر یا اس کے کسی حصہ کا انکار کر کے بھی کیا کوئی مسلمان رہ سکتا ہے۔ اور کیا اس کے باوجود بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ یا مرتد ہو جائے گا اور اس پر ارتداد کی حد جاری کی جائے گی۔

اور اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ (مسلم معاشرہ) میں کسی ایسے فرد کا پایا جانا محال ہے جو ایک عمل بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ کرے پھر بھی وہ مسلمان ہو اور اسی سے اس کا تشخص بھی قائم رہے۔ چہ جائیکہ ایسے معاشرہ میں اس کی زندگی کی ضمانت بھی ہو۔ اس طرح کا خیالی دعوی صرف ان جاہلی معاشروں میں پایا جاتا ہے جو اس ارجائی نظریہ سے وابستہ ہیں جس کا دین کی روح سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

اور اب ذرا اس اہم قضیہ (لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کے معاملہ) پر تین مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالیں جو بالآخر سب ایک ہی نتیجہ تک پہونچاتے ہیں۔

اولاً: اگر کلمہ کا مطلوب صرف تصدیق و اقرار ہے یا اگر صرف تصدیق و اقرار اس بات کے لئے کافی ہے کہ نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی اس کی وجہ سے اسلامی تشخص قائم رہے تو کیا اس صورت میں دین اس حد تک پہونچ سکتا ہے جس کی خاطر وہ آیا ہے۔

ثانیاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں اور مطالبوں کے نفاذ کے لئے جو جد و جہد کرتے تھے کیا ان کا یہ عمل رضاکارانہ تھا، ان پر واجب نہ تھا؟

ثالثاً: کیا نفسیات انسانی کے پہلو سے یہ ممکن ہے کہ ایک انسان ایمان تو رکھتا ہو کسی چیز پر لیکن اس

ــه

کا عمل کلی طور پر اس ایمان کے تقاضے کے برعکس ہو یا کم سے کم متضاد ہو؟

پہلے نکتہ کو لیجئے۔ ہم پوچھتے ہیں اللہ نے رسولوں کو انسانوں کی طرف کیوں بھیجا؟ اور ان کے ساتھ دستور کیوں نازل کئے؟ اس اہم مسئلہ میں ہم اپنی طرف سے کوئی جواب نہیں دیں گے اور نہ کسی کے لئے مناسب ہی ہے کہ اس اہم مسئلہ میں اپنی طرف سے کوئی جواب دے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب اس کتاب میں دیا ہے جس میں کسی پہلو سے باطل کی رسائی ناممکن ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ـه

ترجمہ: (انھیں بتاؤ کہ) "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصره ورسله بالغیب ان اللہ قوی عزیز ـه

"ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور ان لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔"

ــه سورۃ النساء (۶۴) ــه سورۃ الحدید (۲۵)

آخری رسالت (جس کی بنیاد ہمیشہ اور مقاصد مشترک ہیں) پر گفتگو کرنے سے پہلے مذکورہ دونوں آیتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کی رسالتوں پر گفتگو کرتی ہیں۔

چنانچہ ایک آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی جانب سے رسول بھیجے جانے کی مہم صرف اس بات پر مکمل نہیں ہوجاتی کہ وہ رسول بس تبلیغ و اعلان کرے اور جن کے درمیان وہ رسول بھیجا گیا ہے ان کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ بات ان تک پہونچ گئی اور وہ آگاہ ہوگئے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا جانا چاہیے کہ یہ بات جن تک پہونچی، وہ آگاہ ہوا اور پھر اس کی اطاعت کی۔ اسی صورت میں رسول کی پذیرائی کا حق ادا ہوگا اور وہ مطلوب حاصل ہوگا جس کے لئے رسول کو بھیجا گیا ہے۔

دوسری آیت جس مقصد کو واضح کرتی اور اس کی تحدید کرتی ہے وہ ہے: عدل کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر۔ جملہ مختصر ہونے کے باوجود مکمل اور جامع ہے۔ جس کو تفصیل کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات (اور سنت نبوی میں بھی) اس طرح بیان کر دیا گیا ہے کہ پھر اس میں انسانی ہوائے نفس کے لئے گنجائش نہیں رہ گئی ہے، اس لئے کہ اگر عدل کی حد بندی کو انسانی خواہشات پر چھوڑ دیا جائے تو سارا معاملہ ہی سبوتاژ ہو جائے۔

ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السماء والارض ومن فیھن (۷۱) لہ

ترجمہ: اور حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

ابھی جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ انبیاء اور کتابوں کا بھیجا جانا صرف تبلیغ و اعلان کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ عملی طور پر انسانی زندگی میں ایک خاص مقصد کا

لہ سورۃ المومنون (۷۱)

مطلوب ہے۔ یعنی شریعت الٰہی اور نظم الٰہی کا قیام، اور لوگوں کا اس شریعت اور نظام کا پیروکار بن جانے کی مہم، اس لئے کہ اسی ذریعہ کو بروئے کار لا کر حیات انسانی کی تعمیر عدل کی بنیاد پر تمام ہوتی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تصدیق و اقرار کے بعد بھی ایک کام باقی رہ جاتا ہے جس کی تکمیل کے بغیر انبیاء اور کتابوں کے بھیجے جانے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور بایں صورت دین ایک ایسا نعرہ بن کر رہ جاتا ہے جس کے پیچھے کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہوتی۔ دلوں میں چھپی تمنائیں ہوتی ہیں جن سے زندگی کے معمولات میں کوئی تغیر نہیں آتا جیسا کہ آیت میں حدید (آہن) اور اس کے رسول کی نصرت کا ذکر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مطلوبہ اعمال میں جہاد فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ اگر انسان عدل پر قائم رہے۔

جاہلی شاعری کا مطالعہ

ہونے کا قول کیا گیا ہے انہیں زہیر بن ابی سلمیٰ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اس کی شاعری فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ و معیاری ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اس کے معانی شعری فکری اعتبار سے بہت عظیم ہیں خاص طور سے حکمت و فلسفہ اور اخلاقیات کے باب میں اس کا جواب نہیں۔

(ختم شد)

غزل

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

تو ساحل سے چمٹ کر سو رہا ہے
سفینہ غرق تیرا ہو رہا ہے

مقدر کا جو رونا رو رہا ہے
یقیناً وقت اپنا کھو رہا ہے

زمیں پر آگ کی فصلیں اگیں گی
بشر مٹی میں شعلے بو رہا ہے

اندھیرے آدمی کو ڈس رہے ہیں
عجب جشن چراغاں ہو رہا ہے

سکون زندگی ملنا ہے مشکل
زمانہ بیج ایسے بو رہا ہے

تمدن عہد رفتہ کا ہے لیکن
نئی تہذیب میں ضم ہو رہا ہے

گھٹائیں راز ہنس کر پوچھتی ہیں
کہاں پیاسا سمندر رو رہا ہے

ابوسفیان اصلاحی ________ علی گڑھ

محترم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے چند باتیں

آٹھ جون کو شام پانچ بجے مشہور رسالہ "نقوش" کے توسط سے لاہور کی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے "رابعہ کالج" پہنچا۔ رابعہ کالج کی خوبصورتی کو دیکھتے ہی تاج محل کا حسن ذہن میں گردش کرنے لگا اور غیر شعوری طور پر یہ کلمات زبان پر چل پڑے کہ "رابعہ کالج" تو لاہور کا تاج محل ہے، اور یہ تاج محل کسی بادشاہ کی یادگار نہیں بلکہ یہ ایک مولوی کی رہائش گاہ ہے یہ مولوی کسی زمانے میں مدرسۃ الاصلاح پڑھاتا ہوا کرتا تھا۔ علمی دنیا اس مولوی کو مولانا امین احسن اصلاحی کے نام سے جانتی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کئی گرانقدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ان کی کتاب "دعوت دین اور اس کا طریقہ کار" اور تفسیر "تدبر قرآن" سرفہرست ہیں۔ انھیں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ مجھے جو کچھ بھی پوچھنا ہوتا اسے کاغذ پر لکھ کر انھیں پیش کرتا چونکہ مولانا کی قوت سماعت یکسر دم توڑ چکی ہے، البتہ بولتے بالکل صاف ہیں۔ نقاہت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ نمازیں میرے دونوں صاحب زادے اس اندیشہ کے تحت پڑھتے ہیں کہ کہیں میں زمین پر

نہ ہو جاؤں۔ اب زیادہ گفتگو سے بھی طبیعت گھبراتی ہے۔ ان سے کئے گئے کچھ سوالات کے جوابات پیش کئے جا رہے ہیں۔

س: مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب کی خواہش ہے کہ آپ ہندوستان تشریف لائیں۔

ج: ابواللیث صاحب سے میرا ایک خاص تعلق ہے۔ ہندوستان سے اکثر ان کے پیغامات ملتے رہتے ہیں۔ میں ان کے جذبات و اشتیاق کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے خود ان سے ملنے کی شدید خواہش ہے کہ ان سے مل کر کچھ حسرتیں نکالوں۔ اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو آج میرے پیغام چاہنے والے میری نظروں کے سامنے ہوتے۔ انھیں میرا سلام کہو کہ وہ دین اسلام کے لئے کام کرتے رہیں۔

س: نومبر میں ہونے والے فراہی سیمنار میں ہم آپ کو لے کر چلیں گے صرف آپ افتتاحی تقریر کریں۔

ج: ابھی میں نے تم سے اپنی صحت کے بارے میں بتایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ ہندوستان چلوں۔ اگر وہاں گیا تو میرے چاہنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ جماعت اسلامی دلی ہی میں گھیر لے گی۔ اعزا کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان آکر ان سے نہ ملا تو وہ الگ ناراض ہوں گے۔ مادرگل کے فرزندان بھی مجھے گھیر لیں گے اور اعظم گڈھ میں ایک خاص حلقہ بھی مجھے نہ بخشے گا۔ کیا تمہاری اتنی بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ تم سیدھے لے جاؤ گے اور لاکر پہنچا دو گے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے ڈبے میں بند کرکے رکھو گے۔ میرے جانے پر ایک سیلاب پھوٹ پڑے گا اور تم اس سیلاب کو روک نہیں پاؤ گے۔

س: فراہی سیمنار کے لئے آپ کا پیغام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔

ج: ابھی پیغام ریکارڈ کیا کرو گے، جب یہاں سے لوگ چلے جائیں تب میں تحریر یا کچھ ریکارڈ کروا کے دیدوں گا اور اگر ہو سکا تو انھیں املا کرادوں گا۔

سی کے دوران مولانا نے مجھ سے کہا کہ کیا اس کا تعلق علوم القرآن سے ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں اچھے خاصے معاملات میں ادارہ علوم القرآن کے حضرات شامل ہیں اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ سیمنار کے سلسلے میں اگر مجھ سے رابطہ جمال الدین صاحب قائم کریں تو بہتر ہے۔

س: فراہی سیمنار میں کن کن لوگوں کو یہاں سے بھیجیں گے؟

ج: دیکھو فراہیات کے سلسلے میں یہاں دو لوگوں کا خاص تعلق ہے ایک خالد مسعود اور دوسرے جاوید احمد غامدی۔ ان دونوں لوگوں کو میں نے تاکید کی ہے کہ وہ مقالات کے ساتھ سیمنار میں شریک ہوں۔ بقیہ ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ جائیں۔

س: مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب مجھے آپ کا ایک خط دکھا کر بہت دن تک آپ کا ذکر کرتے رہے اور آپ کے دیدار کے لئے ترستے رہے۔

ج: ان سے میرا سلام کہنا، میرا بھی ان سے ایک خاص تعلق ہے۔ ایک زمانے میں انھوں نے مجھ سے بارہا اپنی کتاب "------------" پر کچھ لکھنے کو کہا لیکن میں لکھنے پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ اس میں انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی سیاست اور تصوف سے بحث کی ہوگی اور مجھے ان کی سیاست سے اختلاف تو ہے ہی البتہ تصوف کا تو میں سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔ تصوف دین اسلام کے متوازی ایک دین ہے۔ ایک مرتبہ جب مولانا حسین احمد مدنی رح مدرسۃ الاصلاح پر آئے تو میں انھیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک گیا، اس دوران سیاست ہی موضوع بحث رہی۔ میں نے مولانا سے کہا کہ یہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے مسلمانوں پر اچھے اثرات نہیں پڑیں گے۔ تو اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ تم مجھے پہلے انگریزوں کو بھگا لینے دو اس کے بعد سارے مسائل حل کر دوں گا لیکن

نے مولانا سے کہا کہ آپ کی مسلم لیگ کی یہ مخالفت زیب نہیں دیتی محمد علی جناح ایک صاحب بصیرت انسان ہیں ان کی خدمات مسلمانوں کے لئے بہت ہیں۔ اس تھوڑی سے گفتگو کے بعد مولانا سے رخصت ہونے لگا تو میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت تھپتھپانے لگے اور مجھے اس تھپتھپاہٹ سے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محبت کے نغمے پھوٹ رہے ہوں۔

غزل

(ایم۔اے۔ شمسی دو گھردی)

مجھے نہ چھیڑ کہ میں محویت کا غازہ ہوں
خود اپنے جسم سے لپٹا ہوا لبادہ ہوں

مرا خیال، مری فکر ہے عبث تجھ کو
میں تیری سوچ کی حد سے کہیں زیادہ ہوں

کبھی مٹائے گی کیا مجھکو گردش دوراں
کہ میں یقین ہوں اک عزم ہوں ارادہ ہوں

مری بساط بہت ہی حقیر ہے لیکن
چراغ شب ہوں میں انسانیت کا وعدہ ہوں

فریب مجھ کو نہ دے راہزن بدل کر بھیس
میں راہبر ہوں خود اپنا، خود اپنا جادہ ہوں

مری نظر میں ہے پیچیدگی زمانہ کی
اگرچہ آج بھی شمسی میں سیدھا سادہ ہوں

عبدالبر اثری فلاحی

تعارف و تبصرہ

نام ——— "المسکین" میگزین

ایڈیٹر ——— ضیاء الاسلام قاسمی

ناشر ——— شعبۂ نشر و اشاعت مدرسۃ المساکین بہادر گنج، غازی پور، یوپی

کتابت و طباعت : عمدہ

قیمت : ——— نامعلوم

یہ میگزین پورے ادارے کا ترجمان ہے یا صرف طلبہ کا یہ چیز واضح نہیں البتہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر ایک کی نمائندگی موجود ہے اور آئندہ با قاعدہ رسالہ کی شکل میں پیش کرنے کا عزم شاہد ہے کہ یہ پورے ادارے کا ترجمان ہے۔

اپنی بات کو عام کرنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ کے استعمال کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن اس کے کما حقہ استعمال کے سلسلے میں دینی مدارس کی بے توجہی کسی عجوبہ سے کم نہیں ایسے میں مدرسۃ المساکین کے ذمہ داروں کا یہ اقدام یقیناً ایک فال نیک ہے۔

اس کے اندر مختلف موضوعات پر مشتمل کل ۱۱ مضامین ہیں "قرآن کریم اور مساکین" کافی پسند آیا۔ "عربی مدارس کے کتب خانے" پر لکھا ہوا مضمون تو میرے دل کی آواز ہے عام طور سے دینی مدارس کے کتب خانے لاوارث سے بھی گئے گزرے سمجھے جاتے ہیں، ان کی دھول بھی صاف کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، ترتیب و حفاظت تو دور کی بات ہے اس طرف دینی مدارس کو آپ نے اچھی تذکیر کی ہے، اللہ انھیں اصلاح حال کی توفیق

انداز کرے۔

چند امور قابل توجہ ہیں اگر آئندہ خیال رکھا گیا تو یہ میگزین خوب سے خوب تر ہو سکتا ہے۔

۱۔ جو بھی آیات، احادیث اور عبارتیں نقل کی جائیں ان کا حوالہ بھی دیا جائے۔ ہر جگہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیح کتابت پر مزید اور خصوصی توجہ دیں۔

۳۔ عنادین اور پیش کردہ مواد میں جوڑ ہونا چاہیے۔ مگر مضمون کی عید اور اس کے اندر پیش کردہ مواد میں ربط میری سمجھ میں نہیں آسکا۔

۴۔ آیات وغیرہ کے ترجمے میں احتیاط ضروری ہے مفہوم کی ادائیگی کے لئے اگر کچھ اضافہ کرنا ہو تو قوسین ( ) کے اندر کرنا چاہیے ورنہ غلط فہمی کا اندیشہ رہتا ہے جیسے صفحہ ۸ پر " ماذا ینفقون " کا ترجمہ " صدقات وخیرات کہاں خرچ کئے جائیں اور کیسے دیئے جائیں " ! اسی صفحہ پر " ابن السبیل " کا ترجمہ " مصیبت زدہ مسافر " کیا گیا ہے جبکہ نشان زدہ الفاظ کا متن آیت میں موجود نہیں ہے۔

۵۔ کسی چیز میں مبالغہ بھی حدود کے اندر ہونا چاہیے تجاوز مناسب نہیں جیسے صفحہ ۲ پر جامع مسجد دہلی کے سلسلے میں ہے " دہلی کی جامع مسجد صرف ہندستان ہی نہیں دنیا کی مشہور ترین مسجدوں میں ہے جو درحقیقت تعریف سے بالاتر ہے۔ " لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تعریف سے بالاتر ذات باری تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے

۶۔ ترانہ مدرسہ کا ایک شعر ہے ۔

اگر کچھ اہل ثروت بھی یہاں تھوڑی توجہ دیں   تو شان مدرسہ میں اور ہو جائے فراوانی

یہ شعر مدارس کے شان استغنا کے خلاف ہے جس سے ان کا وقار مجروح ہوتا ہے پھر جا بیکہ اسے ترانے میں جگہ دی جائے، لہٰذا اس قسم کی چیزوں سے اجتناب ضروری ہے۔

اخیر میں اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے آئندہ جاری رکھنے کے عزم کو پورا کرے، اور دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔

● محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ کھلنے کے بعد پھر بند :

ششماہی تعطیل کے بعد ۲۰ اکتوبر سنہ کو جامعہ کھل گئی جبکہ انجمن کی شورٰی اور جامعہ کی انتظامیہ کے اجلاس ملتوی کر دیئے گئے جنہیں اکتوبر سنہ کے آخری عشرہ میں جامعہ میں ہونا تھا۔ ملک کی ہنگامی صورت حال کی بنا پر طلبہ اپنے گھروں سے نہیں آسکے جب کہ اساتذہ وقت پر جامعہ حاضر ہو چکے ہیں طلبہ کے نہ ہونے سے سونا سونا اور اداس ماحول ہے۔

بلاشبہ بعض حالات ٹھیک ہیں لیکن دوسرے علاقوں کا خیال کر کے انتظامیہ کے مقامی ارکان نے مناسب سمجھا کہ جامعہ کو وقتی طور پر بند کر دیا جائے۔ چنانچہ جامعہ ۲ نومبر سنہ سے ۸ نومبر سنہ تک دوبارہ بند کر دی گئی ہے۔ انشاء اللہ ۹ نومبر سنہ سنیچر سے جامعہ کھل جائے گی۔

طلبہ منزل کا نظم الگ :

ابتدائی و ثانوی طلبہ کا دارالاقامہ طلبہ منزل ہے، مشرقی شمال کی طرف پرانی ابتدائی درسگاہ کو طلبہ منزل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یکم نومبر سنہ سے اس کا مطبخ، طعام گاہ اور سارا نظم الگ کر دیا گیا ہے۔ یہیں سے کلیۃ البنات کا بھی کھانا تیار ہو کر جایا کرے گا۔

طلبہ منزل میں طعام گاہ کی تعمیر کے بعد مزید کمروں کی تعمیر جاری ہے۔ اس وقت تین بڑے کمرے تکمیل کے مرحلے میں ہیں۔ ان دونوں کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر بھی ہوگی۔ اس کے بعد ابتدائی و ثانوی کے سارے طلبہ اسی طرف رہائش پذیر ہوں گے۔

چند ماہ قبل طوفانی آندھی میں جامعہ کی چہار دیواری گر گئی تھی! اس کی دوبارہ تعمیر کا کام تکمیل

کے مرحلہ میں ہے۔

امتحان کے نتائج تیار :

ششماہی امتحان کے نتائج تیار ہیں اور موجود طلبہ کو سنائے بھی جا چکے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ گھروں کو یہ نتائج جلد ہی بھجوا دیئے جائیں۔

ایک استاذ جامعہ کا انتقال :

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو جمعہ کے دن جب ہم جامعہ پہونچے تو دلخراش خبر سنی کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو برادر عبدالباری فلاحی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے امتحان کے آخری دن تک ہمارے ساتھ کام کیا تھا۔ تب بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن .....

ماسٹر محمد ادریس صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ کے لئے یہ ایک اور صدمہ ہے۔ مرحوم بلریاگنج کے رہنے والے تھے اور ساری تعلیم جامعۃ الفلاح ہی میں حاصل کی تھی۔ ابھی جلد ہی فارغ ہوئے تھے، کوئی زیادہ عمر نہیں تھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن قدرت غیر شیئں دیکھا کرتی۔ پیٹ میں درد شروع ہوا اور اس نے کافی شدت اختیار کرلی، بیہوش ہوئے اور پھر رات ۲ بجے عجیب تکلیف، کرب اور بے چینی میں کروٹ بدلتے .... گھر والوں کے پوچھنے پر کہ تکلیف بتاؤ، سوائے اللہ اللہ کے زبان سے کچھ نہیں نکلتا۔

ششماہی بعد جامعہ کھلنے کے پہلے ہی دن ایک تعزیتی پروگرام رکھا گیا، مشترکہ کا مجموعی تاثر تھا کہ "جوانوں میں جو بچپن، شوخی اور چلبلا پن ہوتا ہے اس سے بہت دور رہتے ان کے ساتھیوں، استادوں، رشتہ داروں اور اس پڑوس والوں کو ان سے کبھی شکایت نہیں ہوئی خود یہ کسی کی شکایت کرتے تھے اور نہ کسی کی شکایت سنتے تھے، سادہ طبیعت، صفائی پسند اور ایثار سے کام لینے والے تھے، اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرتے اور ساتھیوں کے کام آتے کوئی کلی پھول بنتی ہے اس کی نکہت پھیلتی ہے پھر مرجھاتی ہے تو ملال نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے لیکن وہ غنچے جو بن کھلے مرجھا جائیں، دل کو ملال پہنچتا تو نہیں رہتا"۔

اس پروگرام میں مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی، مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی، مولانا

(بقیہ صـ ۲۹ ـ پر)